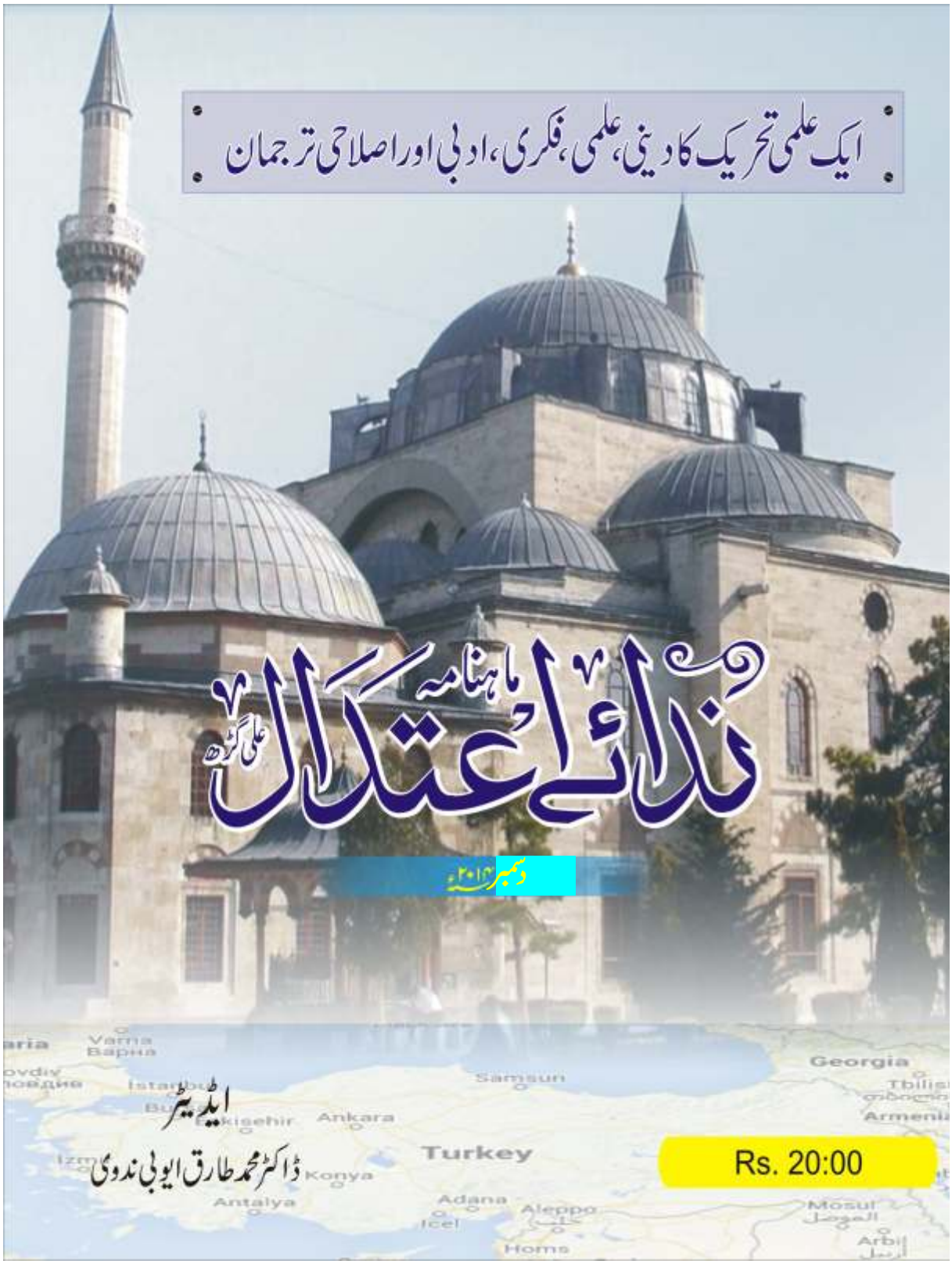

ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

دسمبر ۲۰۱۴ء

ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

Rs. 20:00

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	نہ خدا ہی ملا.....نہ وصالِ صنم	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	مودی حکومت کے عزائم اور ہمارا قومی انتشار	مدیر	۳
۳۔	گوشۂ سیرت	ہندو مذہب کے دو ویدوں نے بھی محمدؐ۔۔(قسط-۱۱)	تحریر:مسٹر اڈیار،مترجم:ایم،اے،جمیل احمد	۷
۴۔	سفرنامہ	کیا سناتا ہے مجھے ترک وعرب کی داستاں	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۸
۵۔	بحث و تحقیق	مستشرقین اور حدیث	محمد فرید حبیب ندوی	۲۳
۶۔	نقطۂ نظر	کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۳۳
۷۔	// //	جامعات میں دینی تعلیم اور عصری تقاضے	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	۳۸
۸۔	// //	اردو شروحات کا بڑھتا رجحان اور طلبہ.....	محمد فرید حبیب ندوی	۴۳
۹۔	اسلامی تعلیمات	محاسبۂ نفس کیوں اور کیسے؟	محمد قمر الزماں ندوی	۴۵
۱۰۔	// //	صفر المظفر ،قرآن وسنت کی روشنی میں	مولانا ندیم احمد انصاری	۴۹
۱۱۔	تربیت اولاد	شخصیت کی تعمیر وتشکیل (قسط-۳)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۳
۱۲۔	توجہ طلب	نئے اسلامی سال کا آغاز.....	مفتی تنظیم عالم قاسمی	۵۶
۱۳۔	زبان و ادب	اقبال کی نظم ،طلباء علی گڑھ کالج کے نام	ڈاکٹر محمد علی جوہر	۶۰
۱۴۔	آخری صفحہ	پھر تو تمہارے لئے یہی کافی ہے	م۔ق۔ن۔	۶۴
۱۵۔		اہم اعلان	ادارہ	

❋❋❋

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

مودی حکومت کے عزائم اور ہمارا قومی انتشار

مودی حکومت نے پہلی مرتبہ اپنی کابینہ میں توسیع کی، وزارتیں تقسیم کرنے میں یوپی اور بہار کا خاص خیال رکھا گیا، اب مرکزی کابینہ میں یوپی کے تقریبا ۱۳ اور بہار کے ۸ وزیر ہو گئے، معلوم نہیں کہ ان دونوں صوبوں پر مودی کی اس مہربانی اور دریادلی سے لوگوں نے کیا نتیجہ نکالا ہو، لیکن میرے ناقص فہم کے مطابق یہ آئندہ ریاستی اور پھر عام انتخاب کی بہت منصوبہ بند تیاری کے لئے ایک ٹھوس اقدام ہے، جس میں کامیابی RSS کو اپنی سوا سو سالہ تمناؤں کو عملی رنگ دینے کی کھلی چھوٹ دے گی۔

ہم نے الیکشن کے بعد اپنے کسی مضمون میں لکھا تھا کہ اس مرتبہ BJP کو جو اقتدار ملا ہے اس کی وہ قدر کرے گی اور بغیر کسی نادانی کے وہ آئندہ ایک ایسے رقص کے لئے اسٹیج تیار کرے گی جس پر ہماری غفلت، بے حسی، ناعاقبت اندیشی اور سیاسی موت کا رقص ہوگا اور وہ لمبی لمبی سانسیں لے کر قہقہے لگائیں گے، جی ہاں! اس وقت بھی میں یہی کہہ رہا ہوں اور جو کہہ رہا ہوں وہ جذباتیت یا مایوسی میں نہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں، جن ریاستوں میں انتخابات ہوئے وہ ہمارے لیے نیک فال نہیں ثابت ہوئے اور یہ جو یوپی و بہار پر مہربانی ہے وہ ان دونوں صوبوں میں ریاستی سطح پر اکثریت حاصل کرنے کی خاطر ہے، BJP کو اگر برہنہ رقص کرنے سے کسی چیز نے روک رکھا ہے تو وہ راجیہ سبھا ہے جہاں ان کی اکثریت نہیں ہے، راجیہ سبھا کے ۱۲ ممبران کو چھوڑ کر باقی کا انتخاب ریاستوں کے منتخب ممبران اسمبلی کرتے ہیں، اس میں بھی بڑا کردار ان دونوں صوبوں کا ہوتا ہے، اب اگر یہاں اکثریت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر راجیہ سبھا میں اکثریت حاصل کرنے سے کون روکے گا، لوگ سبھا تو ایسی ہے جس میں اپوزیشن کا بھی وجود نہیں اور راجیہ سبھا میں بھی اکثریت حاصل ہو گئی تو پھر کیا ہوگا؟ کیا RSS کو پھر کوئی ہندو راشٹر کا اعلان کرنے سے روک سکے گا؟ دفعہ 370 کے متعلق کوئی زبان کھول سکے گا؟ رام مندر کی تعمیر سے کوئی روک سکے گا؟ کیا ان مدارس کی آزادی باقی رہے گی؟ ہم نے پہلے بھی لکھا کہ اس حکومت کے اسرائیل سے بڑے گہرے تعلقات ہیں، اس کے الیکشن کی سرپرستی صہیونی دماغوں نے کی

ہے، مودی، نیتن یاہو کی ملاقات اور وزیر داخلہ کے دورے (دورہ بھی وزیر داخلہ کا خارجہ کا نہیں) نے ان تعلقات کو ثابت کر دیا، ان کے دورے ان ہی ممالک کے ہو رہے ہیں جہاں بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اور ان کا قیمہ بنایا گیا، جس وقت یہ تحریر سپرد قلم کر رہا ہوں عین اسی وقت حضرت مودی کا میانمار میں استقبال ہو رہا ہے، سب کو معلوم ہے کہ جس حال میں بھی صحیح مگر ہندوستان میں ہی مسلمان سب سے زیادہ پرسکون و آزاد ہے، یہود و مشرکین کو یہ بات کب بھائے گی، وزیر داخلہ کے کیا معاہدے ہوئے ہوں گے وہاں؟ اس سے قطع نظر داخلی سیاست کے لئے بہت کچھ اشارے یقیناً دیے گئے ہوں گے، یہ دوستی خارجہ پالیسی کا حصہ نہیں مسلم دشمنی کا نتیجہ ہے لتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين أشركوا (مائدہ:۸۲) (ترجمہ: تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے)

یہ ضرور دیکھنے میں آیا کہ دیگر ذات کے لوگوں نے اپنی اپنی پارٹی کو لے کر ایک دوسرے سے اتحاد کی کوشش شروع کی لیکن ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، اقتدار تک پہنچنے کے لئے وہ اتحاد کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے، پھر اب برہمنوں اور اچھوتوں میں وہ خلیج بھی اس قدر باقی نہ رہی جس پر یہ دیوار زیادہ دیر قائم رہ سکے، پھر اس حقیقت کو بھی نہیں فراموش کیا جا سکتا کہ کفر ہر شکل میں ہمارے خلاف ایک ملت ہے، اب اگر رہبران و دانشوران قوم نے یکسو ہو کر قطعی و حتمی اور متفقہ فیصلہ نہ کیا تو کوئی بعید نہیں کہ ملک میں ۱۸۵۷ء کے بعد جو حالات ہوئے تھے وہی حالات پھر پیدا ہوں اور قوم کو پھر سے اپنے وجود کی لڑائی وہیں سے شروع کرنی پڑے جہاں سے ۱۸۵۷ء کے بعد شروع کی تھی، جس کو بڑا دھچکا ۱۹۴۷ء میں لگا تھا لیکن پھر ذرا سنبھل گئے تھے، یہ وقت سوچنے کا ہے، ہوش کے ناخن لینے کا ہے، گلے شکوے مٹانے کا ہے، ٹکروں اور بوٹیوں کی سیاست چھوڑنے کا ہے فوٹو کھنچانے اور بیان بازی سے گریز کرنے کا ہے، انا کے قتل کا ہے، اس وقت ملت ہندیہ کے مستقبل کا سوال ہے، یہ فیصلہ کن مرحلہ ہے، اب صرف یہی طے ہونا باقی رہ گیا ہے کہ مسلمان اب اس ملک میں اپنے تشخص کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا اپنے وجود کو مٹا کر، اگر اس فیصلہ کن مرحلہ میں کوتاہی ہو گئی تو پھر کئی دہائی صرف احساس شکست کو خود اعتمادی میں تبدیل کرنے میں صرف ہو جائیں گی، قتل عام کی بابت کیا کہنا، لیکن صد افسوس کہ پھر بیان بازیاں شروع ہو گئی ہیں، ''۲۵ کروڑ مسلمانوں کو مٹانا آسان نہیں'' اگر صرف اللہ کے بھروسے پر یہ بات کہی جا رہی ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد و حفاظت کے حصول کی خاطر پہلے وہ تیاری اور وہ کردار حاصل کرنا ہوگا جس پر مدد و حفاظت کے وعدے ہیں، اس طرح کے کھوکھلے دعووں اور وعدوں سے نہ اب تک کوئی نتیجہ نکلا ہے اور نہ مستقبل میں نکلنے کی امید ہے، یہ در پہ

بڑے بڑے جلسوں کی سیاست کے بجائے بڑے کام اور بڑی تیاری کی ضرورت ہے، ایسے جلسے جن طاقتوں کے اشارے پر یا جن کو مضبوط کرنے کے لئے کیے جاتے ہیں وہ طاقتیں اور جماعتیں بھی تو ان ہی میں ہیں جن کے لئے کہا گیا ہے یرضونکم بافواههم وتابی قلوبهم، وأكثرهم فاسقون (توبہ:۸) (ترجمہ: وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں، اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔)

یہ یاد رکھیے کہ اگر BJP ریاستوں میں کامیاب ہوتی ہے اور راجیہ سبھا میں اس کی اکثریت ہوتی ہے نیز مرکز میں وہ دوبارہ آجاتی ہے اور پھر وہ ان اندیشوں کو سچ کو دکھاتی ہے تو اس کی ذمہ داری ہر مؤثر اور ذمہ دار شخصیت پر عائد ہوگی، ہر وسیع حلقہ رکھنے والی بااثر تنظیم پر ہوگی اور وہ لوگ اس کے زیادہ ذمہ دار قرار پائیں گے جو اپنے کو غیر سیاسی بتاتے ہیں لیکن در پردہ اپنے مفادات کے تئیں کسی سیاسی گروہ سے سودا کرتے ہیں اور پھر ان کی کثرت بیان بازی سے پوری قوم کے حصے بخرے ہوجاتے ہیں، ان کی ہوائی باتوں کا فائدہ دشمن کو ہوتا ہے اور مسلمان بے چارے گلیوں سڑکوں پر مبہوت نظر آتے ہیں۔

یک نکاتی متفقہ پروگرام بن سکتا ہے، جو نہ بنانا چاہے اس کی ناعقبت اندیشی اور مداہنت میں کوئی شک نہیں، اس کے لیے بغیر کسی عذر کے صرف اصبروا کی ہدایت پر عمل کرنا ہوگا، قرآن وسنت کی رٹ لگانے والے اگر اب بھی قرآن وسنت کے ادنیٰ سے مطالبے پر عمل نہیں کریں گے تو کب؟؟ قرآن نے صاف کہہ دیا ہے ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم واصبروا إن الله مع الصابرين تنازعات کی حد ہوگئی، مسالک کے تنازعات، نظریات کے تنازعات، علاقائی، خاندانی، خانقاہی، فکری، تنظیمی، جماعتی، گروہی اور شخصی تنازعات کے نتیجہ میں قوم کو ایک ایک محلّہ میں کئی کئی گروہ میں تقسیم کردیا گیا، ملک کی سب سے بڑی جماعت نے تقسیم ہوکر قوم کی اکثریت کو دو نکاتی ایجنڈہ دیا، دیگر بااثر لوگوں کے بیانات نے ایجنڈے کو ہزار نکاتی بنادیا، کیا اب بھی ناکامی نظر نہیں آتی، کیا اب بھی کامیابی کی امید نظر آتی ہے، ناکامی ہوچکی!! اب صرف قرآن کی تعبیر میں ہوا اکھڑنے کا انتظار کیجئے، ہوا اکھڑنے کا مطلب ایسی ناکامی اور ایسی پراگندگی اور ایسا انتشار کہ پھر سنبھلنے کی امید باقی نہ رہے، یقیناً فکر اور نظریات کا اختلاف ممکن ہے لیکن اب تو اختلاف کا سبب نظریات نہیں مفادات ہیں، لیکن اس کے باوجود اب تنازعوا کے تریاق اصبروا کو استعمال کرنا ہوگا، صبر کیا ہے، اپنی رائے کے خلاف عمل کرنا، دوسرے کی رائے تسلیم کرلینا، تنازعات کے وجود وامکان کو تسلیم کرتے ہوئے ہی صبر کی نصیحت کی گئی ہے، صبر کرتے ہوئے اگر سب اپنی قیادت، اپنا مفاد اور اپنی رائے چھوڑنے کا عزم کرلیں،

تو کوئی مضبوط ودائمی واحد ملی قیادت نہ صحیح مگر مذکورہ بالا خطرات سے نمٹنا ممکن ہوگا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی، ملی اور مذہبی تشخص کو محفوظ رکھنے کے لئے اس وقت سخت ضرورت ہے کہ یک نکاتی پروگرام پر ہر کوئی لبیک کہہ دے، قیادت کسی کو ہو، جماعت کوئی ہو لیکن پوری ملت کسی ایک نکتہ پر متفق ہو، اگر ہندوستان میں اب ملت اسلامیہ کم از کم صرف سیاسی محاذ پر متحد نہیں ہوتی ہے تو اسے اگلے چند برسوں میں برادران وطن کی یک قطبی طاقت یعنی ہندو راشٹر میں غلامی کی بدترین زندگی گزارنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

معلوم نہیں یہ آواز رہبروں، دانشوروں اور قائدین ومرشدین اور پیشوایان قوم تک پہنچے گی یا نہیں، اور اگر پہنچ بھی جائے تو پتہ نہیں کان دھرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں، خدا کرے کہ یہ التماس اب صدا بہ صحرا ثابت نہ ہو اور راقم سے زیادہ قائدین ملت کو اس خطرہ کا قبل از وقت احساس ہو جائے، اور سب افراد ملت کو یہ بات سمجھ میں آجائے کہ یہ وقت کسی طرح کی تقسیم کا نہیں بلکہ ہر طرف سے آنکھ بند کر کے صرف اتحاد کا ہے، ورنہ آنے والے لمحات کی ایک خطا کم از کم ایک نہیں تو آئندہ نصف صدی تک ضرور تڑپائے گی۔

ایک نکتہ پر اتفاق صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مسلمانوں کے سب طبقے اور جماعتیں اپنے تمام اختلافات فکر ونظر کے ساتھ صرف سیاسی نقطۂ نظر سے متحد ہو جائیں، سب جانتے ہیں کہ RSS کانگریس کی ہی سرپرستی میں نشو ونما پا کر اب آنکھ دکھانے کے قابل ہوئی، کانگریس کے ہی سبب آج بھگوا رنگ لال قلعہ کی فصیل تک پہنچ گیا، مسلمانوں کے لئے اب بھی یہ ممکن ہے کہ متحدہ فیصلہ کے ساتھ کانگریس کو توبہ کرا کر اس سیاسی صورت حال کا مقابلہ کریں یا پھر اگر اس کو بھی سبق سکھانا چاہیں تو جس ریاست میں جو ریاستی سطح کی پارٹی مضبوط ہو اس سے بہت خاموشی کے ساتھ اتحاد کریں، فیصلہ کچھ ہو لیکن ہر حال میں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ ہنگامہ آرائی نہ ہو اور بیان بازی اور جلسہ وجلوس بازی سے پرہیز کرتے ہوئے کمال حکمت ودانائی کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ٹھوس اقدام کیا جائے اور زمینی سطح پر محنت کی جائے تا کہ ملک وملت کو ایک بڑے خطرے سے بچایا جا سکے۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

☆☆☆

گوشۂ سیرت (قسط- ۱۱)

''اسلام- جس سے مجھے عشق ہے''

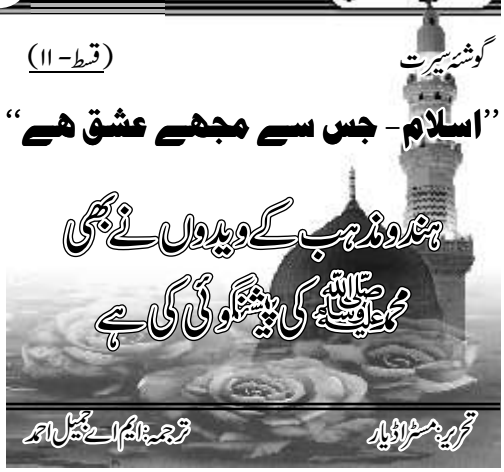

محمدؐ عرب میں چھٹی صدی عیسوی میں پیدا ہوئے۔ مگر اس کے بہت پہلے ان کی آمد کی پیشگوئی ہندو مذہب کے ویدوں میں کی گئی ہے۔ ایک بزرگ سے یہ دعویٰ سن کر میں نے اس کی تحقیق کی۔ ویدوں میں بھی آنحضورؐ کی آمد کی پیشگوئی کو دیکھ کر حیران ہوا۔ مہارشی ویاس کے ۱۸/ پرانوں میں سے ایک پران بھوشیہ پران ہے۔ اس کا ایک اشلوک یہ ہے:

''ایک دوسرے ملک میں ایک آچاریہ اپنے اصحاب کے ساتھ آئیں گے۔ ان کا نام محامد ہوگا۔ وہ صحرا کے علاقہ میں آئیں گے'' (بھوشیہ پران باب ۳ شلوک ۳ سوتر ۵ تا ۸)

واضح طور سے اس اشلوک اور سوتر میں نام اور مقام کے اشارات ہیں۔ آنے والی عظیم شخصیت کی مزید نشانیاں یہ بیان ہوئی ہیں:

''وہ مختون ہوں گے۔ ان کی جٹا نہیں ہوگی۔ وہ داڑھی رکھے ہوں گے۔ گوشت کھائیں گے۔ اپنی دعوت واضح الفاظ میں زوردار طریقے سے پیش کریں گے۔ اپنی دعوت کے ماننے والوں کو موسلائی کے نام سے پکاریں گے'' (باب ۳/ اشلوک ۲۵/ سوتر ۳)

اس سوتر کو بغور دیکھیے۔ ختنہ کا رواج ہندوؤں میں نہیں تھا۔ جٹا یہاں کا مذہبی نشان تھا۔ آنے والی شخصیت ان اجنبی باتوں سے متصف ہے اور واضح نشان دہی کرتی ہے۔ اور پھر اس دعوت کے ماننے والوں کے لیے موسلائی کا نام ہے۔ یہ لفظ مسلم اور مسلمان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اتھروید، باب ۲۰ میں ہم درج ذیل اشلوک دیکھتے ہیں:

☆ ''اے بھکتو! اس کو غور سے سنو۔ تعریف کیا گیا۔ تعریف کیا جانے والا وہ محامہے مہان رشی ساٹھ ہزار نوے لوگوں کے درمیان آئے گا''۔

محمدؐ کے معنی تعریف کیا گیا۔ ان کی پیدائش کے وقت مکہ کی آبادی ۶۰ ہزار تھی۔

☆ ''وہ بیس نرو مادہ اونٹوں پر سواری کریں گے۔ ان کی تعریف وتوصیف جنت تک ہوگی۔ اس مہارشی کے سوسونے کے زیورات ہوں گے۔''

اونٹ پر سواری کرنے والے مہارشی کو ہم ہندوستان میں نہیں پاتے۔ لہذا یہ محمد عربی کی طرف اشارہ ہے۔

سوسونے کے زیورات سے مراد ہجرت حبشہ میں جانے والے آپؐ کے سو جانثار اصحاب ہیں۔

☆ ''دس موتیوں کے ہار، تین سو عربی گھوڑے، دس ہزار گائیں ان کے یہاں ہوں گی۔''

عشرہ مبشرہ دس جنتی کا لقب پانے والے اصحابِ رسول ہیں، جنگ بدر میں حصہ لینے والے ۳۱۳/ صحابیوں کو تین سو عربی گھوڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ دس ہزار گایوں سے آپؐ کی اتباع کرنے والوں کی کثرتِ تعداد مراد ہے۔

قرآن مجید نبی کو رحمۃ للعلمین کے لقب سے یاد کرتا ہے۔

رگوید میں بھی ہے: ''رحمت کا لقب پانے والا تعریف کیا گیا دس ہزار ساتھیوں کے ساتھ آئے گا۔'' (رگوید، منتر ۵، سوتر ۲۸)

اسی طرح وید میں محامہے اور محامد کے نام سے بھی آپؐ کی آمد کا ذکر ہے۔ (جاری)

☆☆☆

سفر نامہ

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں

(ایک ہفتہ استنبول ''قسطنطنیہ'' میں)

بقلم: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، علی گڑھ

راقم سطور کی قسمت نے یاوری کی اور شکوہ ترکمانی کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کا موقع ہاتھ آیا، اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں استاد محترم مولانا سید سلمان حسینی ندوی صاحب کا فون آیا، حکم صادر ہوا کہ ''ایک وفد ترکی جانا ہے اس میں تم کو بھی شامل ہونا ہے'' دراصل یہ وفد ۶ نوجوانوں پر مشتمل تھا جس کا ایک رکن راقم بھی تھا، استنبول میں ملتقی الرواد فی العالم الاسلامی کی چھٹی اور خبراء القدس کی دوسری کانفرنس منعقد ہورہی تھی، ۲۱ تا ۲۶ اکتوبر اس کی تاریخیں مقرر تھیں، لیکن اس حکم کے بعد مستقل ہمارا دل خلافت عثمانیہ کے عروج اور عظمت رفتہ کے اثرات دیکھنے کا مشتاق رہنے لگا، اور دماغ خلافت عثمانیہ کے زوال کی تاریخ و اسباب میں الجھنے لگا، مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے آثار اور یورپ و عیسائی دنیا کے دلوں میں کانٹے کی طرح چبھنے والے شہر قسطنطنیہ کو دیکھنے کی امنگ بار بار انگڑائی لینے لگی، یہ وہی شہر ہے جس کی فتح کے لئے حضور ﷺ نے بشارت دی تھی لتفتحن القسطنطينية فلنعم الأمير أميرها ولنعم الجيش ذلك الجيش (تم قسطنطنیہ ضرور فتح کروگے، خوش نصیب ہوگا اس کو فتح کرنے والے لشکر کا امیر اور خوش نصیب ہوگا وہ لشکر۔)

حقیقت یہ ہے کہ بازنطینی سلطنت کے اس مشرقی پایہ تخت پر سب سے قبل حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں حملہ ہوا جس میں خود حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، لیکن یہ بشارتِ رسالت مآبؐ مقدر تھی نوجوان قائد سلطان محمد الفاتح رحمہ اللہ (۱۴۲۹ء-۱۴۸۱ء) کے لئے، انہوں نے ہی اس شہر کو ۸۵۷ھ میں فتح کیا، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ کوئی اس کو فتح نہیں کرسکتا، اس کو ناممکن بنانے کے لئے انہوں نے انتظامات بھی ایسے ہی کیے تھے، بندرگاہ کی طرف سے دریا کا راستہ روک رکھا تھا لیکن ۲۳ سال کے اس نوجوان فاتح نے وہ عبرت انگیز کارنامہ انجام دیا کہ عیسائی دنیا مبہوت رہ گئی، باسفورس اور گولڈن بارن کے درمیان جو سنگلاخ خلیج ہے اس میں ۵ میل تک لکڑی کے تختے بچھا دیے، اور ان پر چربی ملی گئی جہازوں میں پہیے لگائے اور اس طرح فوجیں سمندر میں اتار کر اس ناممکن کو ممکن بنا کر ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد ڈالی، جس نے آگے چل کر تقریبا تینوں براعظموں کے بڑے حصہ پر حکمرانی کی اور جس کے شکوہ وجلال کے سامنے دنیا

تھراتی نظر آئی، ایک وقت وہ بھی آیا کہ عثمانی سلاطین کے احترام میں گرجا گھروں کے گھنٹے تک بند ہوجایا کرتے تھے اور یورپ کے بڑے بڑے بادشاہ عثمانی سلاطین کی پناہ میں داخل ہوا کرتے تھے، بحر متوسط کے عثمانی تنہا مالک تھے، پطرس اعظم نے ایک مرتبہ قیصر روم کو قسطنطنیہ سے لکھا کہ ''سلطان بحر اسود کو اپنا گھر سمجھتے ہیں جس میں کسی غیر کو داخلے کی اجازت نہیں''۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سلطنت کی بنیاد روحانیت، اسلام پسندی اور علم واسباب کے اختیار پر رکھی گئی تھی، خود سلطان محمد الفاتح (۱۴۲۹م-۱۴۸۱م) کے تذکرہ میں جو بات ایک مغربی مفکر نے لکھی ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔

Baron Carra De Vaux اپنی کتاب ''مفکرین اسلام'' کے پہلے حصہ میں محمد فاتح کے تذکرہ میں لکھتا ہے:

''یہ فتح محمد فاتح کو محض بخت واتفاق سے حاصل نہیں ہوئی تھی، اور نہ اس کا سبب محض بازنطینی سلطنت کی کمزوری تھی اصل وجہ یہ تھی کہ سلطان بہت پہلے سے اس کے لئے ضروری انتظامات کررہا تھا اور اس کے زمانہ میں علم کی جتنی طاقت تھی، اس سے کام لے رہا تھا توپیں اس وقت نئی نئی ایجاد ہوئی تھیں اس نے کوشش کی کہ جتنی زبردست اور بڑی توپ اس زمانہ میں بن سکتی ہے بنائی جائے، اس نے اس کے لئے ہنگری کے ایک انجینئر کی خدمات حاصل کیں جس نے اس کے لئے ایک ایسی توپ بنائی جو تین سو کلو کے وزن کا گولہ پھینکتی تھی، اور اس کی مار ایک میل سے زیادہ کی تھی، کہتے ہیں کہ اس توپ کو کھینچنے کے لئے سات سو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی، اور اس کے بھرنے کے لئے دو گھنٹے چاہئے تھے، جب محمد فاتح قسطنطنیہ فتح کرنے چلا تو اس کی قیادت میں تین لاکھ سپاہی تھے، اور زبردست توپ خانہ، اس کا بحری بیڑہ جو قسطنطنیہ کا سمندر کی جانب سے محاصرہ کئے ہوئے تھا ایک سو بیس جنگی کشتیوں پر مشتمل تھا، اس نے اپنی عقل واجتہاد سے یہ تجویز کیا کہ جنگی بیڑہ کا ایک حصہ خشکی سے خلیج تک پہونچایا جائے، اس نے لکڑیوں پر چربی مل کر ستر جہاز قاسم پاشا کی سمت سے سمندر میں اتار دیئے''۔

لیکن عروج کے بعد زوال دستور کائنات کا حصہ اور تداول ایام کی تفسیر ہے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، رفتہ رفتہ عثمانی سلاطین میں ظلم وجبر کا چلن ہوا، فکری وعلمی جمود کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں اور سادگی وجفاکشی کی جگہ تعیش پسندی نے لے لی، قرآنی اصول (واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلمونهم) سے غفلت برتنی شروع کردی، جب انہوں نے حضرت عمرو بن العاص کی اس نصیحت کو فراموش کیا: ''اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو اور ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہوئے ہو اس لئے تم کو ہمیشہ ہوشیار اور مسلح رہنا چاہیے کیوں کہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں، اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمہارے ملک پر لگی ہوئی ہیں'' تو مغرب ویورپ جو گھات میں لگا ہوا تھا اس نے کمال عیاری کے ساتھ خلافت کی اس قبا کو چاک کرڈالا جس نے عالم اسلام کو دور زوال میں بھی متحد کر رکھا تھا، ٹمٹماتا چراغ صحیح مگر روشنی کا سامان کررہا تھا، سادگی میں اس نے دوسروں کی رعایت کی لیکن دوسروں نے کمال عیاری کا ثبوت دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا اعلان کردیا گیا اور اقبال مرحوم کو کہنا پڑا ؎

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

اس شعر کی معنویت یوں بھی بہت نظر آ رہی تھی کہ میں جس اجلاس میں شریک ہو رہا تھا اس میں فلسطین اور عالم اسلام کے مسائل پر گفتگو ہونی تھی، فلسطین کے تعلق سے سلطان بن عبدالحمید ثانی (۱۸۴۲ء-۱۹۱۸ء) نے جو موقف اختیار کیا تھا اس کانفرنس میں اس کا بار بار تذکرہ ہوا، جب خلافت عثمانیہ قرضوں کے بوجھ میں دبی ہوئی تھی تو یہودی وفد نے پیش کش کی کہ اگر فسلطین میں کچھ جگہ دے دی جائے تو ہم خلافت کا سارا قرض ادا کریں گے، سلطان نے کہا کہ بیت المقدس کی ایک مشتِ خاک تمام دنیا کے خزانوں سے مقدس ہے، وہ ملت کی امانت ہے میں اس کی ایک انچ زمین بھی نہیں دے سکتا، یہ تبھی ممکن ہے کہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں، تاہم اس کے پیش نظر ضروری تھا کہ پہلے خلافت کو ختم کیا جائے تو فلسطین پر خود بخود قبضہ ہو جائے گا، دشمن اسی وقت خلافت کی اہمیت سمجھ گئے اور اس کی منصوبہ بندی میں لگ گئے، خلافت پر جب ڈاکہ ڈالا گیا اور ملت کا شیرازہ بکھر گیا تو اس کی اہمیت و افادیت کو علامہ شبلی نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

زوال دولت عثماں زوال ملک و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند عیال و خانما کب تک

موجودہ استنبول کو دیکھا، گزشتہ دو سالوں سے عالم عربی کے حالات کا مطالعہ کیا، کانفرنس میں لوگوں کے خیالات سنے، عربوں اور اب ترکوں کو کچھ ہی صحیح مگر دیکھنے کا اتفاق ہو، پڑھنے کا موقع تو بار بار ملا تھا، بالخصوص ان دونوں ذہن ہر آن ترکوں اور عربوں کے کردار، اسلام پسندی اور خدمت دین و ملت کے موازنہ میں مشغول تھا، ان حالات میں وہاں پہنچ کر اقبال مرحوم کا یہ شعر بہت خوب لگا۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

استنبول کو دیکھ کر اور مختلف افراد سے مل کر اندازہ ہوا کہ اس وقت پھر سے ترکمان سخت کوش اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور عظمت رفتہ کی بحالی کے لئے کوشاں ہے، ایک طرف عربوں کی لادینیت پسندی، عیش پرستی، ذہنی و فکری غلامی کے ساتھ اقتصادی و سیاسی غلامی ہے تو دوسری طرف ترکی ترقی کے منازل طے کر رہا ہے، اس کی اپنی مصنوعات ہیں، اپنے افکار ہیں، اپنی مؤثر سیاست ہے، مضبوط اقتصادیات ہے، بلکہ اس اطلاع سے خوشی ہوئی کہ ترکی اب بڑے پیمانے پر اسلحوں کی صنعت کے ساتھ اپنی گاڑیاں اور اپنے ایر کرافٹ بھی تیار کر رہا ہے، خدا تعالیٰ وہ دن جلد لائے جب ترکی مکمل طور پر یورپ کا دست نگر ہونے سے نجات پا جائے، ترکی کی خوشحالی کا راز یہ سمجھ میں آیا کہ وہاں تواضع و انکساری ہر شخص میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور ہر شخص تقریباً مشغول ہے، اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرنے کا عادی ہے، چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا ہر کام ہر شخص خود کر رہا ہے، عربوں کی طرح عیاشی اور غلام رکھنے کی ذہنیت وہاں نہیں پائی جاتی، اب کچھ عربوں کو ان کی مدد کے لئے مختلف جگہوں پر جو جس لائق ہو نوکریاں دی گئی ہیں، اس طریقہ سے بڑے پیمانہ پر، فلسطینی، شامی، عراقی اور یمنی پناہ گزینوں کے مسائل حل ہوئے ہیں، اس کے باوجود پناہ گزینوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ استنبول جیسے ترقی یافتہ شہر میں بالخصوص سیاحتی مقامات پر چھوٹے چھوٹے بچے اور عورتیں دست سوال دراز کرتے نظر آئے، حکومت کے تمام تر امدادی اقدامات کے باوجود شامی عورتوں اور بچوں کا یہ منظر بڑا دلخراش تھا، لیکن اس کے پیچھے بھی

عرب حکمرانوں کی عیاری اور ان کی سازشوں کا ہی دخل ہے، ترکی شام ومصر کے انقلاب کو کامیاب کرنے کے لئے کوشاں تھا لیکن صحرائے عرب کی غلام ریاستیں اپنی گدیوں کی حفاظت کے لئے دولت کے خزانے اسلام پسندوں کے قتل اور اسلامی تحریک کے خاتمہ کے لئے لٹارہی تھیں، عرب ریاستیں اسلام دشمنی پر آمادہ ہیں، اسلامی شخصیات کے لئے دائرہ حیات تنگ کررہی ہیں، اسلامی تحریکات کو دیس نکالا دے رہی ہیں، تو دوسری طرف ترکی میں احیائے اسلام کی کوششیں جاری ہیں، اسلامی شخصیات کو پناہ دی جارہی ہے، اسلامی تحریکات کو کام کرنے کے مواقع فراہم کیے جارہے ہیں، استنبول اسلامی تحریکات کا اس وقت سب سے بڑا مرکز ہے، خود ترک نوجوان بڑی اچھی اور اصلاحی تنظیمیں قائم کررہے ہیں موجودہ ترکی میں اس طرح کی تنظیم دیکھ کر بہت خوشی ہے جس نے اپنا نعرہ یہ مقرر کیا ہے القدس امانتی کہ بیت المقدس ہماری امانت ہے، اس تنظیم کا نام جمعیة ارادة العالمیة للشباب ہے، جس کے ارکان بہت فعال نوجوان ہیں، جو ترکی ہونے کے ساتھ عربی بول رہے تھے، کانفرنس کے موقع پر ان کا اسٹال لگا تھا اور وہ مختلف لوگوں کے بیانات تنظیم کے متعلق ریکارڈ کررہے تھے، ہم نے بھی کچھ خوش آئند کلمات ریکارڈ کرائے، دعوت کا کام بھی بڑے پیمانے پر ہورہا ہے، واپسی میں ہماری ہی فلائٹ پر ۴ ترک جوان مرکز نظام الدین آرہے تھے ان سے استفسار پر معلوم ہوا کہ اس سال ۱۰۱۳ تبلیغی جماعتیں نکلیں، عرب میں اسلامی وضع قطع کو اب شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے لیکن ترکی جس پر لادینیت کا ایک خطرناک دور گزرا ہے وہاں اب ٹوپی وداڑھی کو احترام وقدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، عربوں میں خلافت کا ذکر بھی قید وبند کی صعوبت کے لئے جواز فراہم کرتا ہے، لیکن استنبول میں خلافت عثمانیہ کے حوالے سے احیائے خلافت کا تذکرہ ذوق و شوق سے سنا جاتا ہے، سچ کہا تھا اقبال نے ؎

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دین مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

سب سے زیادہ اس سفر میں اگر چہ زیادہ موقع نہ ملا پھر بھی جس چیز نے متاثر کیا وہ ترکوں کی سادہ مزاجی، غرور سے نفرت اور تواضع وانکساری اور اجنبیوں کے احترام کی صفات تھیں، جب کوئی قوم بلند حوصلہ، عالی ہمت اور اقبال مند ہوتی ہے تو اس میں اس طرح کی صفات کا ہونا بعید از عقل اور قابل تعجب بھی نہیں، اور سچی بات یہ ہے کہ حکمرانوں کے اخلاق وکردار کا اثر قوم پر ضرور پڑتا ہے، عربوں کی مہمان نوازی، اور ان کے بلند اخلاق کی ایک تاریخ ہے، لیکن جب سے اپنی اپنی ریاستوں کی حفاظت اور مغرب کی غلامی ان کے اندر آئی اور قومیت و وطنیت کے بت کی پرستش شروع ہوئی تو ان میں نخوت و غرور بھی پیدا ہوا، یقیناً ترکی میں بھی مصطفیٰ کمال (۱۸۸۱ء-۱۹۳۸ء) نے سیاست کو دین سے جدا کرنے کے لئے اسلام کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ترک قومیت کے سحر کا استعمال کیا لیکن جب حکمران بدلے تو آج حالت یہ ہے کہ ان میں دین کا احترام، متدین شکلوں کی قدر، تواضع، مہمان نوازی، انکساری، نرم خوئی ایسی عام ہوئی کہ ٹیکسی ڈرائیور سے لیکر نائب وزیر اعظم اور پارلیمنٹ کے ڈپٹی اسپیکر تک کو اخلاقیات کے اعلی پیمانے پر دیکھا، نہ حاکمانہ طمطراق نہ قومیت کی نخوت، قوم سے محبت اور اپنی زبان سے محبت بھی خوب، لیکن عربی کے احیاء کی فکر، عالم اسلام کے حالات پر نظر و

گفتگو، اور ساتھ ہی ہر ایک سے عام انسان کی طرح ملنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

کانفرنس کی افتتاحی نشست میں شرکت کے لئے نائب وزیر اعظم صاحب آئے، ان کی گفتگو میں عالم اسلام کا کرب، اسلام کے احیاء اور اسکی حفاظت اور مضبوط ترکی کی تعمیر اور فلسطین کی آزادی کا جذبہ تھا، سیکورٹی برائے نام وہ بھی ہوٹل کے باہر، ان کو دیکھا کہ خود بڑھ بڑھ کر ہر ایک سے مل رہے ہیں، ہر ایک سے بات کر رہے ہیں ان کی سادگی اور اخلاقی بلندی قابل دید تھی، ہم لوگوں کو علامہ کوثریؒ کے مشہور شاگرد شیخ امین سراج حفظہ اللہ کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، وہ تواضع وانکساری کا پیکر نظر آئے، لوگوں نے بتایا کہ ان کو ترکی کا ''علی میاں'' کہا جا سکتا ہے، بڑی خاموشی اور جفاکشی کے ساتھ انہوں نے ایک نسل تیار کی ہے، اردوغان اور ان کی ٹیم کے کئی افراد ان کے ارادت مندوں اور تربیت یافتہ شاگردوں میں ہیں، اس بلند مرتبہ پر فائز اس روحانی شخصیت نے نہایت سادگی اور تواضع کے ساتھ تقریبا سوا گھنٹے تک اپنی مجلس میں بیٹھنے کا موقع دیا اور برابر اپنے قیمتی نصائح سے مستفید کرتے رہے، ان کی مجلس کی سادگی اور ذرہ نوازی دیکھ کر خیال ہوا کہ ہمارے ملک میں تو ادنیٰ درجہ کے مولوی حضرات سے ملاقات بھی بہت مشکل اور تکلفات سے گزر کر ہوتی ہے، مسجد سلطان محمد الفاتح میں ظہر ادا کی، نماز کے بعد امام کے لیے مختص کمرے میں گئے تو دیکھا کہ ایک وجیہ پر نور صورت، میانہ قد اور باوقار شخص کرسی پر جلوہ افروز ہیں، بڑے تپاک سے ملے، حالات دریافت کیا، بات بات میں امام العرب والعجم شیخ ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء) کی مدح کرتے رہے، استاد محترم مولانا سلمان الحسینی کی بار بار تعریف کی، اس درمیان ان سے درخواست کی گئی تو اپنی دستخط کے ساتھ اجازت حدیث سے بھی نوازا، جو بات زیادہ قابل غور ہے وہ یہ کہ شیخ اسی طرح سادگی سے رہتے ہیں، یورپ کے اس ترقی یافتہ خطہ میں بھی وہ مادیت سے کوسوں دور ہیں، بتایا گیا کہ ابھی حال میں ہی ان کے صاحبزادے نے گاڑی دی ہے ورنہ بغیر گاڑی کے اپنا کام چلاتے تھے اور کبھی کسی ارادت مند یا صاحب ثروت کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے، اس سے بھی زیادہ قابل غور یہ ہے کہ مجلس میں بلا تکلف ہر عام وخاص آکر بیٹھتا اور ملتا ہے، ہم لوگ جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک صاحب اور بھی آکر بیٹھے، چہرے سے اندازہ ہوا کہ کوئی با وقار شخصیت ہیں، ہم میں سے بعض نے کہا کوئی VIP شخص معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ پوری مجلس میں بالکل خاموش دوزانو بیٹھے رہے اور کسی ایک بات میں بھی مداخلت نہیں کی اور شیخ بھی ہم لوگوں سے ہی مخاطب رہے، ان کی طرف التفات بھی نہ کیا بس سلام و مصافحہ کے بعد وہ آخر تک یوں ہی تشریف فرما رہے، آئندہ روز وہ ہمارے پروگرام میں شرکت کے لئے آئے، ہم ایک طرف کھڑے تھے کہ وہ خود بڑھ کر یوں ہم کلام ہوئے ''اہل ہند کو خوش آمدید'' مختصر سی گفتگو ہوئی مگر ان کی تواضع اور بلند اخلاقی نے حیران کر دیا، معلوم ہوا کہ وہ ترکی پارلیمنٹ کے ڈپٹی اسپیکر ہیں، دوران گفتگو میں نے پوچھا کہ اس وقت کتنے فیصد لوگ اسلام کا احیاء چاہتے ہیں، جواب دیا کہ آپ ۷۰ سے ۸۰ فیصد کہہ سکتے ہیں، یہی نہیں بلکہ معلوم ہوا کہ ابھی کچھ ماہ قبل شیخ امین سراج سے ملنے خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑی سے اردوغان آئے اور ان کے گھر پر مل کر واپس گئے، شیخ کے حالات سن کر

ایسا لگا کہ ان ہی جیسے لوگ ہیں جن کے در پر امراء اور حکام حاضر ہونے میں اپنی سعادت تصور کرتے ہیں۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ڈپٹی اسپیکر صاحب عربی بول رہے تھے، اور بھی جن ترک قائدین کی گفتگو سنی انہوں نے عربی میں حمد وثنا کے بعد اپنی زبان میں گفتگو کی، ترکی کو اسلام سے الگ کرنے کے لئے مصطفیٰ کمال نے نہ صرف ترکی زبان کے عربی رسم الخط کو تبدیل کر کے لاطینی رسم الخط کر دیا تھا بلکہ اذان بھی ترکی میں ہوتی تھی، عربی زبان کا استعمال جرم تھا، کوئی مذاق میں بھی عربی استعمال کر لے یا کہیں لکھ دے تو تین سال کی قید ہوتی تھی اور یہ ادنی درجہ کی سزا ہوتی تھی، اس دور میں احیائے خلافت اور مذہبی جوش رکھنے والوں اور اس راہ کے متوالوں کا قتل جائز اور خون ارزاں تھا، اب جا بجا عربی لکھی نظر آئی، معلوم ہوا کہ وہ استنبول یونیورسٹی جس نے لادینیت کو سب سے زیادہ فروغ دیا عربی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی شروع کر رہی ہے، بہت سے ترک نوجوانوں کو عربی بولتے دیکھا، تسبیح کا خاص رواج دیکھا، خواتین کی خاصی تعداد اسکارف وحجاب میں نظر آئی، ایک تعداد مکمل نقاب میں نظر آئی، مسجدوں میں اچھی تعداد نظر آئی، ڈاڑھیاں بھی نظر آنے لگی ہیں، نجم الدین اربکان مرحوم، عبداللہ گل اور پھر اردوغان کی حکیمانہ قیادت میں جو فکری انقلاب شروع ہوا تھا اس کا رنگ اب نکھر رہا ہے، اس نازک دور میں حق ہے اس مرد بیمار کو پھر تازہ دم ہو کر عالم اسلام کی قیادت کا فریضہ انجام دینے کا، جس نے پہلے بھی بڑے نازک حالات میں عالم اسلام کو نہ صرف سہارا دیا تھا بلکہ اس کو سنبھالا تھا، سچ ہے کہ جب حکمرانوں کے مزاج بدلتے ہیں تو عوام کے مزاج میں بھی تبدیلی آتی ہے، وہاں امن وامان کا حال یہ ہے کہ کہیں پولیس نظر نہیں آتی، اور جہاں سیکورٹی کے لیے پولیس متعین ہے وہاں اس کا کردار نہایت شریفانہ ہے، ایر پورٹ پر ایسی بھیڑ کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں، مگر یہاں کی طرح اندر جانے کیلئے نہ ٹکٹ کی ضرورت ہے اور نہ مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے، بلا تردد امیگریشن تک لوگ اپنے مسافروں کو وداع کرنے جاتے ہیں اور ہر عمل اتنی سرعت کے ساتھ ہوتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، فوج کے پر اگر چہ کتر دیے گئے ہیں اور بغاوت کے امکانات کو تقریبا ختم کر دیا گیا ہے لیکن معلوم ہوا کہ بہت کچھ اصلاحی واخلاقی تبدیلی کے باوجود اب بھی فوج میں اتاترک کے عناصر باقی ہیں۔

استنبول ترکی کا سب سے خوبصورت، آراستہ، منظّم ترقی یافتہ شہر ہے، اس کا ایک حصہ ایشیا میں ہے اور دوسرا حصہ یورپ میں جو اصلا قسطنطنیہ ہے، جس کی بنیاد ۴۷۶ء میں قسطنطین اعظم (۲۷۲-۳۳۷) نے ڈالی تھی، درمیان میں سمندر ہے، سمندر پر دو پل تعمیر ہوئے ہیں جبکہ تیسرا تعمیر ہو رہا ہے، ان پلوں پر سے ہزاروں گاڑیاں روز گزرتی ہیں، حتمی لمبائی کا اندازہ نہیں لیکن سمندر کے اوپر کوئی ڈیڑھ کلومیٹر کی لمبائی ہے، دونوں کنارے پر ستون ہیں، درمیان میں کوئی ستون نہیں، اوپر کو کچھ ستون نظر آئے جن پر تار کھنچے ہوئے ہیں، سمندری سیر میں یہ نہ سمجھ میں آسکا کہ وہ کس موٹائی کے تار ہیں یا کوئی اور چیز ہیں، لیکن اس ٹکنالوجی کے ذریعہ ان کو روکا گیا ہے، ایک صاحب نے بتایا کہ اس پل کو روکنے میں کسی طرح کی گیس کو بھی استعمال کیا گیا ہے، لیکن ہمیں بظاہر اوپر کو بلند ستون اور ان پر کھنچے تار ہی ان پلوں کا سہارا لگے،

معلوم ہوا کہ سمندر کے اندر شہر کے دونوں حصوں کو جوڑنے کے لئے میٹرو بھی چلائی گئی ہے جس کے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا، شہر میں ٹرانسپورٹ کے لئے سرکاری بسیں چلتی ہیں، میٹرو چلتی ہے، میٹرو بس چلتی ہے، سڑکوں کے درمیان ہی ایک حصہ خاص ہے جس پر صرف یہ بس دوڑتی ہے کوئی دوسری سواری نہیں چلتی، اس ایک بس کی لمبائی ہمارے یہاں کی تین بسوں کے برابر ہوگی، اس کے علاوہ جدید ٹکنالوجی سے آراستہ ٹرام بھی چلتی ہے، ٹیکسی اور نجی سواریاں الگ، ٹرافک بہت ہوتا ہے، یورپی حصے کی آبادی گھنی ہے، میٹرو اور میٹرو بس کے ذریعہ ہی سفر میں عافیت ہوتی ہے، دونوں کے اسٹیشنوں پر ایسا جدید ٹکنالوجی سے آراستہ نظام ہے کہ افراد اور سیکورٹی کی ضرورت نہیں، کارڈ بنادیا جاتا ہے، پھر وہ مشین میں لگا کر پیسہ ڈال کر ریچارج ہوجاتا ہے، اسکرین پر کارڈ ٹچ کرنے سے کرایہ وصول ہوجاتا ہے، جو لوگ درمیان میں بسوں میں داخل ہوتے ہیں، ان کے لیے بسوں میں ہی اگلے دروازے پر اسکرین لگی ہے، اس پر عوام خود کارڈ ٹچ کرتے ہیں اور کرایہ وصول ہوجاتا ہے، یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ جو لوگ بھیڑ کے سبب اگلے دروازے سے نہیں داخل ہو پاتے بلکہ وہ درمیانی یا پچھلے دروازے سے داخل ہوجاتے ہیں وہ اگلے دروازے پر پہنچ کر کارڈ ٹچ کر کے کرایہ دینے کا مکمل التزام کرتے ہیں، ایک موقع پر دیکھا کہ ایک خاتون نے کارڈ ٹچ کیا تو اس کے اکاؤنٹ کے پیسہ ختم ہوچکے تھے، قریب کھڑی دوسری عورت نے اپنا کارڈ دے دیا کہ اسکو ٹچ کردیں، اس خاتون نے اسکو معاوضہ دینا چاہا تو اس نے انتہائی تواضع کے ساتھ تشکر آمیز لہجہ میں پیسہ لینے سے انکار کر دیا، ایک موقع پر دیکھا کہ اسٹیشن پر کھڑے واحد سیکورٹی کے فرد نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا کارڈ ختم ہوچکا ہے اور وہ جلدی میں ہے تو اس کو دوسرے اوپن راستہ سے یہ کہہ کر جانے دیا کہ آگے جا کر ریچارج کر کے ٹچ کر دینا، عوام کی امانت داری اور ان پر یہ اعتماد اور اس طرح کی ذہنیت وتواضع اور مشغولیت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس قوم کی ترقی کا راز ان ہی صفات میں مضمر ہے، درحقیقت جب حکمراں اور قائدین امانت دار ہوتے ہیں تو عوام بھی امانتدار بن جاتے ہیں اور تالیاں دونوں ہاتھ سے ہی بجتی ہیں، ہمیں ترکی کی ترقی میں دونوں کا کردار اس مختصر سے سفر میں صاف نظر آیا اور ان مواقع پر اردوغان کا وہ انٹرویو بھی یاد آیا جو کوئی ڈیڑھ سال پہلے لیا گیا تھا، اس میں ان سے سوال کیا گیا تھا کہ آپ نے ایسا کیا کیا کہ ترکی ۱۱۸ نمبر سے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں آٹھویں نمبر پر آگیا اور وہ ۵۴ سال پرانے آئی، ایم، ایف کے قرض سے نجات پا کر قرضے دینے کی پوزیشن میں آگیا تو انہوں نے صرف چھوٹا سا جواب دیا تھا کہ ''میں چوری نہیں کرتا'' اور اب یہ دیکھا کہ جب وہ اس برائی سے پاک ہیں تو ان کے عوام کو بھی اس کی عادت پڑ گئی ہے کہ کوئی کرایہ وصول کرنے والا نہیں وہ خود ہی کرایہ دے رہے ہیں۔

اس کانفرنس میں بہت سے ممالک کی نمائندگی ہوئی، تقریباً ۳۶/ممالک سے ۵۰۰/افراد شریک تھے، ان میں سے اکثریت کا تعلق کم از کم فکری طور پر صحیح لیکن اخوان وحماس سے تھا، شام میں اخوان کے مراقب عام کو دیکھا، مصر کی اخوانی حکومت کے وزیر اعلام ڈاکٹر صلاح کو دیکھا ان کی مرتب اور جذباتیت سے قدرے دور تجزیاتی گفتگو سنی، افریقی

ممالک کی اچھی نمائندگی تھی، الجزائر سے کافی پیرو جوان شریک تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تحریک اس وقت سب سے اچھی حالت میں الجزائر میں ہی ہے، افریقہ کے ایک پرانے ندوی فاضل شیخ احسان ہنڈرکس کی جذبات سے لبریز تقریر سنی، سب تقریباً خلیجی ممالک کی منافقانہ پالیسیوں پر ماتم کناں تھے، موری تانیا کے پارلیمان کے ڈپٹی اسپیکر نے صاف طور پر کہا کہ بیت المقدس کی آزادی کا راستہ شام ومصر سے ہوکر جاتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کو فتح کیا جائے تو فلسطین خود بخود آزاد ہوجائے گا، مزید زور دے کر کہا اور بجا کہا کہ اسد وسیسی جیسے بدکرداروں نیز مغرب کے پٹھوؤں اور اسرائیل نوازوں کو اگر مکمل شکست ہوجائے تو قضیۂ فلسطین خود بخود حل ہوجائے گا، القدس کے مجاہد، تحریک اسلامی کے نائب صدر شیخ کمال الخطیب نے اس بات کو اور مدلل انداز میں کہا، قدس کی فتح کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مصر وشام فتح ہوں، مجاہد اسلام حضرت صلاح الدین ایوبیؒ (۱۱۳۸ء-۱۱۹۳ء) نے پہلے مصر وشام پر کنٹرول حاصل کیا تھا اگر چہ اس میں ان کو بڑا وقت لگا تھا ورنہ فلسطین تو وہ بہت آسانی سے فتح کر لیتے، ہم نے مصر کے فوجی انقلاب کے بعد ربیع عربی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک طرف ترکی عالم اسلام کی نصرت وقیادت کو تیار کھڑا ہے، دوسری طرف مصر میں اخوانی حکومت کام شروع کر چکی تھی اور شام میں انقلاب آخری مراحل میں تھا، اور اسرائیل کو اپنی موت نظر آنے لگی تھی، اس کے حلیف خلیج کے منافقوں کو اپنی کرسیوں کا خطرہ تھا، اس لیے شام کے انقلاب کو ناکام کیا گیا، مصر میں اسلام پسندوں کی جگہ یہودیوں کے لیے دولت لٹائی گئی اور یمن شیعوں کے حوالے کیا گیا، اور اب ترکی میں انتشار کے لئے یہود ونصاریٰ کے ساتھ ہماری صفوں کے منافقین بھی ہر آن کوشاں ہیں، کوئی دو ہفتہ قبل ایران کے وزیر خارجہ کا یہ بیان کہ ''اردوغان خلافت عثمانیہ کا خواب دیکھ رہے ہیں، جو انتہائی خطرناک ہے'' ایران کی ترک وسنّی دشمنی کے علاوہ ایران اور اس کے حلیفوں کے ارادوں کا عکاس ہے، لیکن اب تک ماضی کے اس مرد بیمار، حال کے حکیم حاذق اور انشاء اللہ مستقبل کے قائد ملت نے ان کی موشگافیوں اور بدنظری سے اپنے آپ کو بچا رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے، ظاہر ہے کہ اللہ بھی نیتوں کے مطابق فیصلے فرماتا ہے اور پھر اس کی مدد شامل حال ہوتی ہے، کانفرنس میں ترکی کی بھی اچھی نمائندگی تھی اور ترک میڈیا زبردست کوریج دے رہا تھا، دیگر حضرات کے علاوہ قابل ذکر شخصیات میں وہاں کے نائب وزیر اعظم نعمان کورتو طوش اور حکمراں جماعت کے نائب صدر ڈاکٹر نور الدین نباتی کی بھی تقریر ہوئی، دونوں ہی حضرات اسلام کی نصرت کے لئے پرعزم نظر آئے، ہمارے وفد کی نمائندگی ہمارے فاضل دوست مجیب الرحمٰن ندوی کر رہے تھے جو مؤسسة القدس کے ہندوستان میں باضابطہ نمائندے ہیں، انہوں نے بھی بڑی مؤثر اور علمی گفتگو کی، انداز خطابت میں تو وہ اپنے شیخ ومربی کے مقلد ہیں اس لیے اس کی بابت کیا کہنا؟ اپنی بات انہوں نے حضرت مولانا علی میاںؒ کے اس تاریخی جملہ پر ختم کی جو گویا ٹیپ کا بند اور حاصل مجلس تھا، سامعین نے اس کی قدر کی اور داد دی، حضرت مولانا کا وہ تاریخی اور مختصر وجامع جملہ کچھ یوں ہے ''قضیہ فلسطین کا حل ممکن اور بہت آسان ہے، عربوں کی فتح اسی وقت ممکن ہے

جب وہ اپنے تصرفات میں آزاد ہوں، ان کی زمام ان ہی کے ہاتھ میں ہو، وہ اپنی سیاست میں خودمختار ہوں، وہ اپنے لشکر اور اپنی جانوں کو نچھاور کرنے والے ہوں، اللہ کی نصرت پر ان کو بھروسہ ہو، اپنے اسباب پر ان کو یقین ہو، مادیت و خواہشات کے وہ باغی ہوں اور جہاد و استقلال کے لئے پر عزم ہوں''۔

کانفرنس کے اکثر اخراجات ایک مصری خاتون ڈاکٹر اُمل خلیفہ نے برداشت کیے، بڑی صالحہ اور فاضلہ خاتون تھیں، قضیہ فلسطین میں ان کا اختصاص ہے، ان کی گفتگو میں علمی رنگ ہونے کے ساتھ وہ جذبہ بھی جھلک رہا تھا جو درحقیقت اس قضیہ کے حل کے لئے درکار ہے، عمومی اجلاس میں ان کی زبان بھی بہت صاف اور فصیح ومؤثر تھی، البتہ بعد کے علمی محاضرات میں عامی زبان کا بھی خوب استعمال کیا جس سے استفادہ میں پریشانی ہوئی۔

عالم اسلام کے مسائل پر مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا، داعش کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات معلوم کیے لیکن کوئی قطعی اور حتمی رائے سامنے نہ آئی، البتہ جو لوگ منفی موقف کے حامل تھے ان کی تاویلیں بڑی اوچھی تھیں، ایک صاحب بغداد یونیورسٹی کے لکچرار اور غالبا اخوان کے رکن و ذمہ دار، سیاست شرعیہ کے متخصص آئے تھے، ان سے بات ہونے لگی تو ان کی سختیوں کی بات کرنے لگے، سختیوں کی مثال دیتے ہوئے گویا ہوئے کہ مثلا وہ خواتین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نیم برہنہ لباس نقاب وغیرہ کے نیچے یا مغربی ملبوسات نہ پہنیں، عورتیں اعتراض کرتی ہیں تو وہ سزا دیتے ہیں، جب یہ عرض کیا گیا کہ کیا وہ اسلامی عمل کو چھوڑنے پر زور دیتے ہیں یا غیر اسلامی عمل چھوڑنے کو کہتے ہیں تو وہ خاموش ولاجواب ہوگئے، درحقیقت عام طور پر عرب بڑے عیش پسند اور ظاہری وذاتی زندگی دونوں میں بری طرح مغربیت زدہ ہوگئے ہیں، متدین لوگوں کو بھی دیکھا کہ ان کی بیویاں نقاب ایسا پہنے شریک جلسہ ہیں جنہیں شرعی نقاب کہنا بہت دشوار، چہرے کے پردہ میں یقیناً علماء حق کا اختلاف ہے لیکن مکمل میک اپ کے ساتھ چہرے کو ظاہر کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں، لیکن کیا کیجئے کہ عموماً یہی کیفیت نظر آتی ہے، قصر خلافت میں جب ہم ٹہل رہے تھے، تو کچھ دوشیزاؤں کی عریانیت پر نظر پڑ گئی، مغربی تہذیب کا جادو ان پر سر چڑھ کا بول رہا تھا، میں نے سوچا کہ یورپ میں یہ منظر بعید از قیاس اور قابل تعجب نہیں اس سے زیادہ مکروہ مناظر بھی استنبول میں نظر آتے ہیں، لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ لڑکیاں لادین یا عیسائی گھرانوں سے تعلق رکھتی ہوں گی، لیکن ان کی آواز نکلی تو عربی بول رہی تھیں، معلوم ہوا کہ لہجہ سے یہ شامی ہیں اور بعض شامی لڑکیوں نے یورپی دوشیزاؤں کے بھی کان کاٹ لیے ہیں۔

درحقیقت دیندار طبقہ کا بھی مزاج تقریبا سیکولر بن چکا ہے، اس لیے کسی طرح کی سخت بات یا خالص اسلامی نظریات پر عمل دشوار نظر آتا ہے، داعش کے متعلق گفتگو میں جہاں بہت سی باتیں سامنے آئیں وہیں بغداد کے ان صاحب جنہیں شیخ صلاح کے نام سے مخاطب کیا جا رہا تھا سے پوچھا گیا کہ ابوبکر بغدادی کوئی مجہول نام ہے یا آپ لوگ ان سے واقف ہیں، اس کے متعلق جو فحش اور عجیب وغریب ویڈیو آئی ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط، تو انہوں نے جو جواب دیا وہ چونکانے والا تھا، کہنے لگے میں ان کو جانتا ہوں، زمانہ طالب علمی میں ساتھ رہا ہے، وہ

فلوجہ کے ہیں، (ان صاحب اصلا بھی فلوجہ سے متعلق ہیں) سادات میں سے ہیں، ان کے متعلق جو ویڈیو آئی ہیں وہ غلط ہیں، اگر انہیں چشم دید گواہ تسلیم کرلیا جائے تو پھر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف ویڈیوز اور خبریں جو آتی ہیں ان کی کیا حقیقت ہوگی، مختلف بیانات کے بعد ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ شاید غلطی فکر کی نہیں بلکہ داعش کے طرز عمل کی ہے، اور ان کو قبول کرنے میں یہ بھی ایک بڑا سبب مانع نظر آتا ہے کہ بہت سے وہ گروپ اور وہ جماعتیں جنہوں نے بڑی محنتیں کی ہیں ان کو شاید یہ بات ہضم نہیں ہو پا رہی ہے کہ اب پھل کھانے کے وقت داعش کیوں پھل کھائے، اقتدار چھوڑنا بہت دل گردے کی بات ہے، سیکولر انداز اور خلافت کی بات دونوں میں بڑا فرق ہے اور ان جماعتوں کی اکثریت سیکولرزم کے ساتھ اسلام کی تطبیق کے لئے کوشاں ہے باقی واللہ اعلم بالصواب، اس تنظیم اور پیدا شدہ صورت حال کے بارے میں کوئی قطعی رائے دینا ہمارے بس کی بات نہیں، اس سے پہلے اس قدر تضادات کبھی شاید سامنے نہیں آئے، بہر کیف ان باتوں کے بعد ہمیں مناسب لگتا ہے کہ پروفیسر محسن عثمانی صاحب کا تجزیہ اس سلسلہ میں صحیح تھا اس میں ہماری مذکورہ بالا ان دو باتوں کا اضافہ کرنے کے بعد ان کا تجزیہ پڑھیے جو انہوں نے اپنے مختصر سفرنامہ میں متعدد اشخاص سے گفتگو کے بعد لکھا تو شاید حقیقت حال تک پہنچنے میں کچھ اور مدد مل سکے، وہ لکھتے ہیں:

''عراق سے بھی بہت سارے مندوبین آئے تھے، داعش کے سلسلہ میں کنفیوژن تھا، چنانچہ اس کنفیوژن کو دور کرنے کے لئے عراق سے آنے والے اراکین سے ہم نے گفتگو کی ہم نے ان اراکین کو مختلف الخیال پایا۔ ایک معزز رکن جو نوری المالکی کی حکومت کے اہل سنت پر مظالم کے چشم دید گواہ تھے اور داعش کے بہت مؤید اور حامی تھے، یہ کہنے لگے کہ داعش کے ظلم و استبداد کا بہت شور وغوغا ہے اور پچھلے تین سال سے ہر ہفتہ پندرہ سولہ سنی حضرات کو پھانسیاں دی جارہی تھیں اس پر لوگوں نے واویلا کیوں نہیں مچایا، پورے عراق سے فوج اور تمام اہم منصب سے ایک ایک کرکے اہل سنت والجماعت کو ہٹایا گیا، آج اگر داعش کے لوگ کھڑے نہیں ہوتے تو مظالم کا یہ سلسلہ بھی جاری رہتا۔ ایک دوسرے معزز عراقی رکن سے بعد میں جب اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں کردی ہوں اور کردستان کی آزادی کا حامی ہوں، ہمیں یہ گوارا نہیں کہ داعش کا کردستان پر قبضہ ہو اور تیل سے مالا مال یہ علاقہ ان کے قبضہ میں چلا جائے۔ ایک اور معروف عالم دین جو شام کے رہنے والے ہیں اور رابطہ ادب اسلامی کے ممبر بھی ہیں اور جن کا نام خالد الہنداوی ہے، انہوں نے کہا کہ میں شام اکثر جاتا رہتا ہوں اور مجاہدین سے میری ملاقات بھی ہوتی ہے، داعش کے اندر وہ خصلتیں ہیں جو تاریخ اسلام کے شروع میں خوارج کے اندر پائی جاتی تھیں، خوارج گناہ کا ارتکاب کرنے والے کو کافر کہتے تھے، داعش والے بھی تارکِ نماز کو بہت آسانی سے گولی مار دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر مختلف خیالات کو سننے کے بعد یہ بات ذہن میں آئی کہ اگر داعش والوں میں تشدد اور انتہا پسندی نہ ہوتی، میانہ روی ہوتی اور وہ لوگوں کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ کرتے تو ان کے ساتھ ہمدردی ہوتی اور پھر ذوق جہاد اور شوق شہادت کی وجہ سے وہ بغداد اور دمشق پر قبضہ کرسکتے تھے اور مستقبل میں اسرائیل سے نپٹنے والے بھی یہی مجاہد قسم کے لوگ ہوتے، کاش یہ لوگ اپنی

اصلاح کرلیں اور غلطیوں سے باز آجائیں۔ الاتحاد العالمی کی عالمی تنظیم نے داعش کے دعوی خلافت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے داعش کے سلسلہ میں جتنے منہ اتنی باتیں، کوئی کہتا ہے ان کو بشار الاسد نے کھڑا کیا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ امریکہ نے اور کوئی کہتا ہے سعودی عرب نے۔ شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا۔''

ہماری پریشانی یہ تھی کہ ہم کو یورپی حصہ کے استنبول کے مرکزی علاقہ سے جو فاتح کا علاقہ کہلاتا ہے تقریبا ۴۵ کلومیٹر دور نئے علاقے میں جو اونچی اونچی عمارتوں کا علاقہ تھا ایک 5 اسٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا، جس کا نقصان یہ ہوا کہ ہم اپنے وقت کا صحیح استعمال نہیں کر پائے، پھر بھی جیسے بن پڑا طائرشوق نے اڑاڑ کر تاریخی درختوں کی روح افزا خوشبو سے اپنے جذبۂ شوق کی تسکین کا سامان کیا، اس ہوٹل میں کانفرنس رکھنے پر ہمیں عجیب وحشت ہوئی اور طبیعت پر بڑا اثر ہوا اور مفکر اسلام کی یہ بات بار بار یاد آئی، ایک موقع پر مولانا نے لکھا ہے:

''مصنف کے دردمند دل کو یہ دیکھ کر اور بھی زیادہ صدمہ ہوا کہ بہت سے خالص دینی حلقوں میں بھی مدح و ذم اور تعریف و تنقید کا معیار کسی شخص کی اسلامیت اور غیر اسلامیت اور اسلام و مسلمانوں کا سود وزیاں نہیں رہا، بلکہ خالص دنیاوی کارنامے، مادی فتوحات (اور افسوس وحیرت ہے کہ یہاں اس کا بھی وجود نہیں) سیاسی پروپیگنڈہ، اخبار نویسوں اور اہل سیاست کا خراج تحسین، ماتمی جلوس اور جنازہ کی دھوم دھام اور اس طرح کی سطحی اور ظاہری شکلیں رہ گئی ہیں، اس سے مصنف کو یہ انکشاف آمیز احساس ہوا کہ دینی حمیت اور اسلامی غیرت میں جو اس طبقہ کا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار تھا تیزی کے ساتھ انحطاط آرہا ہے، اور یہ وہ نقصان ہے، جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں''

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت خالص دینی حلقوں میں بھی وہی مغرب کی عیش پسندی اور اونچی عمارتیں، دولت وآرام دہ گاڑیاں اور رہائشیں تعریف و مذمت کا معیار بن چکی ہیں، حیرت ہوئی کہ فلسطین کے المیہ اور اس کی حساسیت اور عالم اسلام کے حساس مسائل پر گفتگو کے لئے عامۃ الناس کے مال سے اتنی پرتکلف کانفرنس منعقد کی گئی، یقیناً اسمیں بہت سے اچھے اور میدان عمل کے شہسوار آئے، افکار سے پردہ اٹھا، جذبات میں ہیجان برپا ہوا، کام کرنے کے طریقے سامنے آئے لیکن مادیت کی چکاچوند سے دامن نہ بچ سکا، کم از کم مجھ جیسے شخص کو تو بار بار الجھن ہوئی اور خدا گواہ کہ ایک پل بھی ہوٹل کی فضا اچھی نہ لگی، جبکہ بہت سے لوگوں کو پرتکلف، انواع و اقسام کے کھانوں سے لذت حاصل کرتے اور وہاں کے آرام سے لطف اندوز ہوتے دیکھا، ہم نے بعض حاضرین سے صاف کہا کہ کیا ضرورت ہے اس طرح کے تعیش کی، یہ کانفرنس تو سستے اور معمولی ہوٹل میں بھی منعقد ہوسکتی تھی، ایسا کرنے سے ایک خطیر رقم بچتی جس سے کوئی عملی کام کیا جاتا، مقترحات لکھنے کا موقع ملا تو اسمیں بھی ہم نے یہی لکھا کہ اگر ہم قدس جیسی امانت کو واپس لینا چاہتے ہیں تو لازمی ہے کہ ہم عمل اور سادگی میں اپنے ماضی کی طرف اس قدر لوٹتے جائیں کہ قرن اول سے جا ملیں اور اسباب ووسائل کے اختیار میں اس قدر آگے بڑھیں کہ دنیا حیران ہوکر گھٹنے ٹیک دے ایک مورخ Renou Lovis نے اپنی کتاب ''الغارۃ علی فرنسا'' میں مسلمانوں کے متعلق لکھا ہے: ''اندلس کے عربوں نے فرانس کے دونوں جنوبی کناروں پر سمح الخولان، عنبسہ الکلبی اور حر

الثقفی کی قیادت میں حملہ کیا اور بونہ فرتشونہ، افنیون اور میون کے علاقے کو فتح کر لیا، وہ عرب اس وقت جن اسلحوں سے لیس تھے انگریزوں کے پاس اس جیسی کوئی چیز نہ تھی''۔

ڈاکٹر گستاؤ لیبان نے واضح اعتراف کیا ہے: ''عربوں نے جو مستعدی تحصیل علم میں ظاہر کی وہ فی الحقیقت حیرت انگیز ہے، اس خاص امر میں بہت سی اقوام ان کے برابر ہوئی ہیں لیکن بمشکل کوئی ان سے بازی لے جا سکی''۔

یہ حقائق واعترافات تاریخ میں بکھرے پڑے ہیں، سطور بالا میں خود ہم نے سلطان محمد الفاتح کے متعلق پڑھا کہ انہوں نے کس طرح جنگ کی تیاری کی، آج صورت حال مختلف ہے، علمی شغف اور ایجاد و اختراع سے ہمارا دور کا واسطہ نہیں، ہمارے عرب ممالک امریکہ واسرائیل کے لئے سب سے بڑی تجارتی منڈی ہیں، پھر ان سے آگے بڑھنے اور ان کی غلامی سے نجات پانے کی امید چہ معنی دارد! غلبۂ اسلام کی مالا جپنے کے لئے ضروری ہے کہ دینی بیداری اور اخلاقی تربیت کے ساتھ دنیا کے تمام وسائل کی تسخیر کی جائے اور ایجاد واختراع کے میدان میں سب کو پیچھے چھوڑا جائے، موجودہ ترک حکومت سلطنت عثمانیہ کے عہد اول بلکہ اسلام کے عہد زریں کی طرح ترکی میں احیائے اسلام کی کوششوں کے ساتھ تعلیم وتحقیق پر بہت توجہ دے رہی ہے، ساتھ ہی اس نے صنعت وایجاد کی دنیا میں بھی مؤثر اقدامات کیے ہیں، مغرب کی اس خالص ظاہری تقلید ومرعوبیت سے چھٹکارا پائے بغیر فتح وکامرانی نصیب ہونے کا امکان بہت کم ہے۔

مولانا سلمان حسینی صاحب کے صاحبزادے یونس الحسینی جامعہ سلطان الفاتح الوقفیہ میں ایم اے علوم اسلامیہ کے طالب علم ہیں، نہایت ذہین وباصلاحیت ہیں، ان میں صلاح بھی ہے اور صلاحیت بھی، اور شاید سر لابیہ کی تعبیر ان جیسے لوگوں پر صادق آتی ہے، انہوں نے بڑی حد تک ترکی زبان سیکھ لی ہے اور دعوتی کام اور فکری تشکیل کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں، ان کی وجہ سے بڑی آسانی ہوئی، انہوں نے اچھی خاصی ضیافت بھی کی اور بڑی جفاکشی کا ثبوت دیتے ہوئے کچھ تاریخی مقامات کی جھلکیاں دکھائیں اور سمندر کی سیر بھی کرائی، سمندر کی سیر کے دوران اس کے کنارے پر وہ عمارت بھی دیکھی جہاں سلطان عبدالحمید ثانی (۱۸۴۲ء-۱۹۱۸ء) کو آخر میں قید کیا گیا تھا، دونوں کنارے پر مرتب عمارتوں اور خوبصورت مسجدوں کے بلند منارے عظمت رفتہ کی کہانی سنا رہے تھے اور ترکوں کی اقبال مندی کا ثبوت دے رہے تھے۔

خوشا نصیب کہ اس سفر میں اپنے جد امجد حضرت ابوایوب انصاریؓ کی تربت پر حاضری کی سعادت بھی نصیب ہوئی، مزار مبارک دیوار قسطنطنیہ کے قریب ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ ان کو دیوار قسطنطنیہ کے نیچے دفن کیا گیا تھا، لیکن موجودہ مقبرہ اور مسجد کی تعمیر سلطان محمد الفاتح نے کی۔

سلام وفاتحہ کے بعد اس سے متصل مسجد ابوایوب کی پرشکوہ عمارت دیکھی مسجد میں زبردست نقاشی اور عثمانی ذوق تعمیر کی مہارت نظر آتی ہے، ہر مسجد کی طرح یہاں بھی آیات نقش ہیں، بہت اونچا منبر ہے، محراب کے برابر اس شعر کا کتبہ لگا تھا۔

یتشمرمی بوشہرک خلقنہ بو نعمت باری
حبیب اکر مک یاری ابا ایوب الانصاری

(کیا ترک قوم کے لئے یہ نعمت باری کافی نہیں ہے کہ یہاں کی تربت میں حضورﷺ کے دوست ابوایوب انصاریؓ مدفون ہیں)

مسجد سلطان محمد الفاتح گئے، اس کے عظمت و جلال کو دیکھا، اس میں نظم وصفائی اور خوبصورت قالینوں نے جہاں ذوق سلیم پر دلالت کی وہیں مساجد کے احترام اور دین پسندی کا ثبوت بھی فراہم کیا، ظہر کی نماز باجماعت پڑھی، نماز کے بعد وہاں معمول ہے کہ کچھ خاص تسبیحات واذکار بلند آواز سے ہوتے ہیں، کچھ آیات کی تلاوت بھی ہوتی ہے، امام صاحب کو دیکھا کہ وہ باوجود اپنی خوش الحانی کے الحادزدہ ترکی کی یاد تازہ کر رہے تھے، اب تو وہاں داڑھی پر پابندی نہیں، لباس کے اختیار میں آزادی ہے، حجاب کے اختیار میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے، لیکن ان کو دیکھا کہ چہرے پر ہلکا سا برائے نام خط تھا، نماز کے بعد انہوں نے اپنی عبا اتار کر رکھی، عمامہ کنارے کیا اور یورپ کے لباس میں باہر نکلے، یہ وہ طریقہ تھا جو مصطفیٰ کمال (۱۸۸۱ء-۱۹۳۸ء) نے لازم قرار دیا تھا، اب اس طریقہ کو لوگ چھوڑ رہے ہیں، مسجد سے متصل سلطان کی تربت پر حاضری ہوئی، فاتحہ پڑھی، کچھ لمحے ان کا جلال، ان کے جذبۂ اسلامی اور یورپ میں شکوہ اسلام کا جھنڈا نصب کرنے کی داستان میں ذہن کھویا رہا، مسجد سے متصل فاتح کتب خانہ ہے جو اب بند ہے اس کا ذخیرۂ کتب سلیمانیہ کتب خانہ میں منتقل کر دیا گیا ہے، اس سے متصل وہ مدرسہ بھی دیکھا جس میں ائمہ و حفاظ تیار کیے جاتے تھے، مصطفیٰ کمال (۱۸۸۱ء-۱۹۳۸ء) نے ایسے سب مدارس بند کر دیے تھے لیکن اب اسے پھر آباد کر دیا گیا ہے، اس کی مرمت کا کام جاری تھا، مسجد سلطان بایزید دیکھی، مسجد سلطان احمد میں ظہر کی نماز ادا کی، ایسی عظیم الشان، پرشکوہ اور نیلے شیشوں سے مزین، عمدہ بلکہ عجیب وغریب نقاشی سے آراستہ مسجد کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں، ترکی کی تقریبا تمام مساجد میں باہر سے کچھ نہ کچھ یکسانیت بلکہ بہت کچھ یکساں نظر آتی ہیں، لیکن داخلی منظر سب کا الگ اور سب میں مختلف کشش ہوتی ہے، مساجد سے متصل عمارتیں ہوتی ہیں، جن میں اب مختلف سرکاری دفاتر ہیں، مسلمان قدیم دور میں مسجد کو مدرسہ بناتے تھے، بعد میں مسجد سے متصل مدرسہ، مہمان خانہ، دارالاقامہ اور کتب خانہ وغیرہ کی تعمیر ہونے لگی، ہر مسجد کے باہر ایک وسیع صحن ہوتا ہے جو تقریبا ہر مسجد کا یکساں ہے، موجودہ حکومت میں وقف کے ادارہ کو بڑی آزادی حاصل ہے، وہ پوری لگن سے مساجد کی مرمت اور ان کے انتظام کر رہا ہے، مساجد میں نظم و صفائی، اس کی خوبصورتی کی حفاظت اور تزئین کا اہتمام نظر آیا، اذانوں میں بھی عجیب جلال و جمال کی آمیزش کا تجربہ ہوا، مسجد سلطان احمد سے نکل کر اس سے کچھ فاصلہ پر مسجد ایا صوفیا آئے، ابھی اس کے باہر ہی تھے کہ مسجد سلطان احمد میں عصر کی اذان ہوئی، اللہ اکبر کی صدا ختم ہوئی تو لگا کہ اب ٹکرا کر یہ آواز ایا صوفیا سے آرہی ہے، ہمارے دیگر ساتھیوں کا بھی یہی تاثر تھا لیکن پھر ایک خبیر نے یہ راز فاش کیا کہ اس میں بھی اذان شروع کر دی گئی ہے جس کی خبر ابھی لا دینوں کو نہیں ہے بس اس وقت کا انتظار ہے جب نماز شروع کی جائے، مسجد ایا صوفیا وہ مسجد ہے جو عیسائی دنیا کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھتی ہے، جس کے منارے کو وہ پھوٹی آنکھ دیکھنا نہیں پسند کرتے، یہ مسجد در حقیقت ایک گرجا گھر ہے، اس کی تعمیر ۵۳۲ء سے شروع ہو کر ۵۳۷ء میں مکمل ہوئی، یہ بازنطینی حکمرانوں کے فن تعمیر کا اعلی نمونہ ہے، یہ گرجا اشبیلیہ کے گرجا گھر کی تعمیر سے قبل تقریبا ایک ہزار سال تک دنیا کا سب سے بڑا گرجا رہا، لاطینی زبان

میں اسے، Sancta Sophia اور ترکی میں Ayasofya کہا جاتا ہے، اس کی بلندی ۱۸۰ رفٹ، چوڑائی ۲۴۰ رفٹ اور لمبائی ۲۶۹ رفٹ ہے، عمارت دو منزلہ ہے، سنگ مرمر کا فرش ہے، خوبصورت قسم کی نقاشی ہے، ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد اس میں منبر و محراب کا اضافہ کر کے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا، عثمانیوں نے اس کی نقاشی، رنگ و روغن اور تزیین کاری میں خوبصورت ترین اضافہ کیا، سولہویں صدی کے مشہور زمانہ معمار سنان پاشا (۱۵۰۶ء-۱۵۹۶ء) نے اس میں نئے منارے نصب کیے، وسط میں حضور ﷺ اور خلفاء کے نام کی تختیاں لگائی گئیں، نیچے سے دیکھا تو بڑی چھوٹی معلوم ہوئیں بالائی منزل پر گئے تو محسوس ہوا کہ ان کی گولائی ۲۰ رفٹ سے کم نہیں ہوگی، یہ عمارت کئی مرتبہ زلزلوں سے متاثر ہو چکی تھی مگر ترکوں نے اس کے ارد گرد تعمیر کر کے اس کو ایسا مضبوط سپورٹ دیا کہ وہ آج تک قائم ہے، ۱۴۵۳ء سے ۱۹۳۵ء تک اس کی مسجد کی حیثیت باقی رہی، لادین اور یہودی نسل کے ترک مجدد کا اہم کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے اسکو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا، عمارت کے باہر بعض ایسے اثرات نظر آئے جس سے اس کا گرجا ہونا معلوم ہوتا ہے، اندر بھی بالائی منزل پر رنگ و روغن اکھڑنے سے بعض بازنطینی دور کی تصاویر ابھر آئی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تعمیر بازنطینی فن تعمیر کا شاہکار اور دنیا کی عظیم و قدیم عمارتوں میں سے ہے، اس وقت بھی یہ مسجد سیاحوں کی آماجگاہ ہے، بے شمار عیسائی آتے ہیں، محراب و منبر کے قریب کے حصہ میں حد بندی ہے، وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں، ہم نے بھی اس حد کے باہر کھڑے ہو کر تصویر لی، نماز بھی ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس قدیم عمارت کا مسجد میں تبدیل ہونا یورپ کو کب گوارہ لیکن وہ دن پھر جلد ہی آنے کو ہے جب بارگاہ الٰہی میں اس عمارت کے فرش پر سجدۂ شکر ادا کیا جائے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ ترکوں کی تعمیر کردہ مساجد اور بالخصوص سنان پاشا (۱۵۰۶ء-۱۵۹۶ء) کی تعمیر کردہ مساجد پر ایا صوفیا کی کچھ نہ کچھ چھاپ ضرور نظر آتی ہے،

وقت کی قلت تھی مگر کسی طرح ہانپتے کانپتے ہم لوگ عثمانی خلفاء کے قصر خلافت اور موجودہ میوزیم توپ کاپے پہنچ ہی گئے، اچٹتی صحیح مگر عظمت رفتہ کے نقوش پر نظر پڑ ہی گئی، صفائی ستھرائی اور باقیات و مقدسات کی حفاظت کا اہتمام عثمانیوں کے ذوق کی یاد دلا رہا تھا، فن تعمیر اور نظم و نسق کے ساتھ مقدسات کی حفاظت میں عثمانیوں کو بڑا ملکہ حاصل تھا، قصر کے صدر دروازے پر جب کلمہ طیبہ اور داخلی حصہ پر نصر من اللہ و فتح قریب نقش دیکھا تو عثمانیوں کے رعب و ہیبت اور جلال کا راز فاش ہوا، اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافت عثمانیہ کی بنیاد میں روحانیت بمعنی اسلام پسندی اور اسلامی تربیت کو دخل تھا، جابجا آیات اور عربی عبارتوں کے نقش دیکھے، پتھر پر عربی اور عربی رسم الخط میں ترکی زبان میں خطاطی کے شاہکار دیکھے، سمندر کے کنارے محل کے جائے وقوع کے انتخاب پر بھی ذہانت کو داد دینی پڑی کہ کوئی سمندری راستہ سے عثمانیوں کی آنکھ میں دھول جھونک کر نہیں جا سکتا، قصر کے ایک حصہ میں مقدسات محفوظ ہیں، ان میں حضرت حسین کا کرتا حضرت فاطمہ کا کرتا، اور چھوٹا سا صندوق، حضرت خالد اور بعض دیگر صحابہ کے ساتھ خلفاء اربعہ کی تلواریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور پاک ﷺ کی ریش مبارک کے بال اور آپ

کی تلواروں اور آپ کے پیالہ کا بڑے شوق واحترام سے دیدار کیا، یہ حسرت باقی رہی کہ حضورؐ کے کرتے اور حضرت عثمانؓ کے اس مصحف کی زیارت کرتا جس پر شہادت کے وقت ان کے خون کی چھینٹیں پڑی تھیں کیوں کہ سیکورٹی کے افراد نے بتایا کہ وہ صرف ۱۵ رمضان کو دکھایا جاتا ہے، مقدسات کے اس حصہ میں عثمانیوں کے دور سے تلاوت کلام اللہ کا التزام ہے، درمیان میں یہ سلسلہ منقطع ہوا تھا مگر اب حکومت نے قراء متعین کردیے ہیں وہ ۲۴ گھنٹے تلاوت میں مشغول رہتے ہیں، ان قابل ذکر چیزوں کے علاوہ کچھ اور عثمانیوں کی باقیات دیکھیں، محل میں کتب خانہ بھی ہے جو ہمارے پہنچنے تک بند ہو چکا تھا اس کے دیدار کی حسرت دیگر تاریخی آثار اور کتب خانوں وغیرہ کے دیدار کی طرح آئندہ کے لیے رکھ چھوڑی، قصر خلافت کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں ایک بینک کے سائن بورڈ کی طرف اشارہ کرکے بتایا گیا جس پر اس کا نام ترکی زبان میں یہ لکھا تھا Turkiye is bankasi (بنک العمل الترکی)، یہ بینک اس رقم سے قائم ہوا تھا جو رقم ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی خستہ حالی کے باوجود احیائے خلافت کے جذبہ سے اس کے قرضوں کی ادائیگی کے لئے جمع کرکے بھیجی تھی، یہ بات تو بہت مشہور ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑی قوت کے ساتھ خلافت تحریک چلائی تھی جس کا اثر یہاں تک تھا کہ ہندوستان کی عورتوں نے اپنے زیورات تک اتار کر بھیج دیے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ایک مومن ماں کے جذبات کا غماز یہ شعر تھا۔

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

لیکن ترک ناداں کا ظلم وفریب کہ اس نے ان جذبات کا یہ صلہ دیا کہ خلافت کے خاتمہ کا اعلان کرکے اس فنڈ سے ترک قوم کی ترقی کے لئے یہ بینک قائم کیا، عجائبات کو دیکھتے ہوئے بھی ترکوں کی شرافت نفسی اور تواضع کا تجربہ ہوتا رہا اور سچ یہ ہے کہ شاید اسی تواضع میں ان کی کامیابی کا راز پنہاں ہے، ہمارے یہاں عام طور پر یہ مزاج ہے اور آثار قدیمہ کی زیارت میں اس کا خوب تجربہ ہوتا ہے کہ سیکورٹی والے ہندوستانی اور مسلمان سمجھ کر دھکے دیتے ہیں اور تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں، اجنبی سیاحوں سے خوب اینٹھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں دیکھا کہ میوزیم وغیرہ کا ٹکٹ ترکوں اور سیاحوں کے لیے یکساں تھا، ترک سیکورٹی کے لوگ ہر بات کا جواب نرم خوئی اور خوش اسلوبی سے دیتے تھے اور ہر استفسار پر نہایت احترام سے پیش آتے تھے۔

۷ بج چکے تھے، میوزیم بند ہونے کی بیل ہو چکی تھی، ہم بھی دن بھر ایک ایک منٹ کو استعمال کر لینے کی دھن میں تھک کر چور ہو گئے تھے، زخمی دل، مجروح جذبات، ماضی کی یادیں اور مستقبل کی حسرتیں لیے کچھ باتیں کرتے قصرِ خلافت سے باہر آئے، غیر شعوری طور پر میری زبان سے عربی میں کچھ الفاظ نکلے جو اس دعا پر مشتمل تھے کہ اے اللہ ایک بار پھر ہمیں پرامن متحدہ خلافت کے سایہ میں زندگی گزارنے کا موقع فراہم کر دے، ہمارے ساتھی بھی ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوئے اور پھر سب کی زبان سے آمین کی آواز سنائی پڑی، بعد میں دیکھا تو اقبال مرحوم بھی کہہ گئے ہیں۔

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

☆☆☆

بحث و تحقیق

مستشرقین اور حدیث

تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

مستشرق گولڈ زیہر نے الزام لگایا ہے کہ اموی حکومت نے امام زہری کو وضع حدیث کے اپنے مشن کے لئے استعمال کیا تھا، اس کے لئے موصوف نے کئی دلائل بھی پیش کئے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان دلائل کا تجزیہ کرنے سے پہلے امام زہری کی شخصیت کے بارے میں کچھ تفصیل پیش کر دیں جس سے از خود یہ واضح ہو جائے گا کہ امام موصوف پر لگائے گئے یہ الزامات حقیقت ہیں یا محض بہتان۔

امام صاحب پر موصوف نے الزام تراشی جو کی ہے وہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ اس کی یہ منصوبند پلاننگ ہے کہ اساطین حدیث کو ایک ایک کر کے مطعون قرار دے دیا جائے، چنانچہ اس نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر بھی اس طرح کا الزام لگایا ہے، کیوں کہ جب اساطین حدیث پر ہی سے اعتماد جاتا رہے گا تو حدیث پر خود بخود بھروسہ ختم ہو جائے گا۔

امام زھری ایک عظیم شخصیت:

آپ کا نام ابو بکر محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب بن عبداللہ بن حارث بن زہرہ قرشی زہری ہے، اکیاون ہجری میں پیدا ہوئے، آپ کے والد مسلم بن عبید اللہ امویوں کے خلاف جنگوں میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، آپ نوجوان تھے کہ آپ کے والد کی وفات ہوگئی، آپ کے پاس کوئی مال و متاع نہ تھا، یتیمی اور فقیری کی حالت میں پروان چڑھے، بڑے بھائی کے علاوہ آپ کا کوئی مربی بھی نہ تھا، (بڑے بھائی کے بارے تاریخ میں تفصیلات نہیں ملتیں)

آپ نے سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کرنے پر توجہ دی، آپ کے بھتیجے محمد بن عبداللہ کے بقول آپ نے صرف اسّی (۸۰) دن میں حفظ مکمل کر لیا، پھر عبداللہ بن ثعلب سے علم الانساب سیکھا، اس کے بعد حرام وحلال کا علم حاصل کرنے اور حدیث کی سماعت کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور جن جن صحابہ سے ملاقات ممکن تھی ان کے پاس پہنچے، دس صحابہ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، جن میں حضرت انسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ، اور سہل بن سعدؓ شامل ہیں، پھر اس کے بعد اپنے زمانے کے کبار تابعین سے کسب فیض کیا جن میں سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود

اور ابو بکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام مخزومی رحمہم اللہ جیسے علماء ہیں، سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ کی صحبت میں سب سے زیادہ آٹھ سال رہے۔

آپ شام خوب آیا جایا کرتے تھے، سب سے پہلے نوجوانی میں مروان کے زمانہ میں شام آئے، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد عبدالملک بن مروان سے آملے اور اس کے بعد دوسرے اموی خلفاء جیسے ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید ثانی اور ہشام بن عبدالملک کے ساتھ رہے، آپ عراق اور مصر بھی آتے جاتے تھے، ۷۲ سال کی عمر میں ۱۲۴ھ میں وفات ہوئی۔

آپ کے نمایاں اخلاق و اوصاف

آپ کوتاہ قد تھے، داڑھی ہلکی تھی، سر اور ڈاڑھی پر مہندی لگاتے تھے، آنکھوں میں معمولی سا چندھا پن تھا، زبان و بیان کے شہسوار اور فصیح الکلام تھے، یہ بات مشہور تھی کہ تین لوگ سب سے زیادہ فصیح ہیں، زہری، عمر بن عبدالعزیز اور طلحہ بن عبیداللہ۔

آپ کا سب سے نمایاں وصف جود وسخا ہے، لیث بن سعد کہتے تھے کہ جن لوگوں کو میں نے دیکھا، زہری ان میں سے زیادہ سخاوت کرنے والے تھے، جو سائل بھی آپ کے پاس آتا اسے محروم نہ کرتے، خود پاس کچھ نہ ہوتا تو اپنے اصحاب سے قرض لیتے، ان سے بھی نہ ملتا تو اپنے غلاموں سے قرض لیتے، بسا اوقات جب کچھ نہ ملتا تو افسوس کرتے اور سائل کو دعا دیتے کہ انشاء اللہ خدا خیر کا معاملہ فرمائے گا، اور پھر ایسا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے انتظام بھی کر دیتا چنانچہ یا تو کوئی آپ کو ہدیہ دے دیتا یا کچھ سامان بیچ کر قیمت کی وصولی میں کچھ مہلت دے دیتا اور آپ اس سائل کی مدد فرما دیتے۔

آپ کے اوصاف میں دو وصف بہت نمایاں تھے

: ۱۔ طلب علم کے لیے جدو جہد اور مشقت برداشت کرنا۔ چنانچہ آپ راتوں رات جاگ کر حدیثیں سنتے، علماء سے ملاقات کرنے کے ہمیشہ حریص رہتے، جو کچھ سنتے اسے لکھ لیتے، علم کی طلب میں علماء کے دروازے پر پڑے رہتے۔

کتابوں سے اشتغال کا یہ عالم تھا کہ آپ کی اہلیہ پریشان ہو جاتیں اور ایک مرتبہ کہنے لگیں کہ آپ کی یہ کتابیں تو میرے لئے تین سوکنوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہیں۔

حدیثیں سننے کے بعد گھر آ کر اپنی باندی کو بیدار کرتے اور اسے سناتے، وہ کہتی بھی کہ میرا اس سے کیا فائدہ؟ فرماتے کہ میں جانتا ہوں کہ تیرا کوئی فائدہ نہیں، مگر اس طرح سنی ہوئی حدیثوں کا مذاکرہ کر لیتا ہوں۔

۲۔ قوت یادداشت اور بے مثال حافظہ۔ اس بارے میں تو آپ ایک عجوبہ تھے۔ قرآن صرف ۸۰ دن میں حفظ کر لیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جو یاد کر لیتا ہوں اسے بھولتا نہیں۔ صرف ایک مرتبہ ایک حدیث کے بارے میں شک ہوا مگر وہ بھی میرے حافظہ کے مطابق نکلی۔

ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ عبدالملک نے اہل مدینہ کو سرزنش کا ایک خط لکھا، یہ خط دو صحیفوں میں مکمل ہوا، اور مدینہ میں مسجد کے منبر سے لوگوں کو سنایا گیا۔ حضرت سعید بن مسیّب موجود نہیں تھے، جب پتہ چلا تو چاہا کہ اسے سن لیتے۔ ایک دو لوگوں نے سنانے کی کوشش بھی کی مگر کوئی بھی مطمئن نہیں کر سکا، بالآخر حضرت امام زہری نے جوں کا توں سنا دیا اور ایسا محسوس ہوا گویا دیکھ کر پڑھ رہے ہیں۔

ایک مرتبہ بغرض امتحان ہشام بن عبدالملک نے اپنے لڑکے کے لئے امام صاحب سے چار سو حدیثیں املاء کرائیں اور پھر ایک مہینے کے بعد کہنے لگا کہ وہ ضائع ہوگئیں، امام صاحب نے دوبارہ املاء کرادیں۔ جب دونوں کو ملایا گیا تو ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں تھی۔

امام موصوف شہد خوب پیتے تھے اور فرمایا کرتے کہ اس سے حافظہ تیز ہوتا ہے۔ اور اسی طرح کشمش کھانے کا مشورہ دیتے، اس کے برعکس کھٹے سیب اور سرکہ سے پرہیز کرتے اور فرماتے کہ اس سے ذہن کمزور ہوتا ہے۔

مرجعیت اور شہرت

اس محنت ولگن اور علم وفضل کی وجہ سے آپ کو مرجعیت حاصل ہوگئی تھی، چنانچہ آپ کے بارے میں امام مالک فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں دیکھا کہ ستّر، اسّی سال کے شیوخ کو چھوڑ کر لوگ کم عمر زہری سے حدیثیں سنتے تھے۔

فن حدیث میں آپ کا مقام و مرتبہ

عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ہم نشینوں کو امام زہری کے پاس جانے کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اب ان سے زیادہ حدیث کا جاننے والا کوئی اور موجود نہیں۔

علی بن مدینی فرماتے تھے کہ ''ثقہ لوگوں کی مرویات چھ لوگوں کے اردگرد ہی گھومتی ہیں، حجاز میں امام زہری اور عمرو بن دینار کے، بصرہ میں قتادہ اور یحیی کے، اور کوفہ میں ابواسحاق اور اعمش کے۔

عمرو بن دینار فرماتے ہیں، حدیث کا ماہر زہری سے زیادہ کوئی نہیں۔

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں۔ حدیث کے بارے میں امام زہری سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں۔

مکحول نے فرمایا: کہ روئے زمین پر امام زہری سے بڑا حدیث کا عالم کوئی اور نہیں بچا۔

علم حدیث کے میدان میں آپ کے کارنامے: حدیث کے میدان میں آپ کے تین کارنامے بہت اہم ہیں۔

۱۔ حدیث کی جمع وتدوین۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے آپ نے یہ کام انجام دیا، آپ سب سے پہلے مدون ہیں جیسا کہ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے۔ یہی قول امام مالک کا بھی ہے۔

ابن عساکر کی تاریخ میں بھی میں نے دیکھا کہ حدیث کی تدوین کی نسبت امام موصوف ہی کی طرف ہے۔

۲۔ کچھ حدیثیں صرف آپ ہی سے مروی ہیں، اگر آپ انہیں روایت نہ کرتے تو وہ ضائع ہوجاتیں، سعید حجمی کا یہ جملہ ابن عساکر نے نقل کیا ہے کہ اگر ابن شہاب نہ ہوتے تو بہت سی حدیثیں گم ہوجاتیں، امام مسلم نے صحیح میں روایت کیا ہے کہ ''امام زہری نوّے حدیثوں میں منفرد ہیں، اور سب کی سندیں عمدہ ہیں۔

۳۔ اسانید پر توجہ دینے کی روایت آپ نے ہی شروع کی، جیسا کہ امام مالک نے فرمایا ہے کہ: حدیث کی اسناد کا سلسلہ (غالباً ملک شام میں) سب سے پہلے زہری نے شروع کیا۔

علماء جرح و تعدیل کی رائے امام زہری کے بارے میں:

زہری ثقہ، وسیع العلم اور کثیر الروایہ ہیں۔ (ابن سعد)

چار سندیں سب سے عمدہ ہیں جن میں سے دو یہ ہیں: زہری عن علی ابن الحسن عن أبیہ عن جدہ، اور زہری عن عبید اللہ عن ابن عباس۔ (نسائی)

زہری سند کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے عمدہ ہیں (امام احمد)

ابوزرعہ سے پوچھا گیا کہ کونسی اسناد سب سے صحیح ہے تو آپ نے فرمایا، چار، ان میں پہلی سند یہ ہے: زہری عن سالم عن أبیہ (ابن أبی حاتم)

ابن حجر، ذہبی اور دوسرے بہت سے علماء نے آپ کو حجۃ، ثقہ اور فقیہ حافظ، امام المحدثین جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔

آپ کے تلامذہ

آپ سے بہت سے حضرات نے روایت کی ہے، مشہور ترین لوگوں میں امام مالک، امام ابوحنیفہ، عطاء بن أبی رباح، عمر بن عبدالعزیز، ابن عیینہ، لیث بن سعد، امام أوزاعی، اور ابن جریج جیسے علما و محدثین ہیں، حدیث کی تقریبا تمام ہی کتابوں میں آپ کی مرویات موجود ہیں، بلکہ شاید حدیث کے ابواب میں کوئی باب مشکل سے ہی ملے گا، جس میں آپ سے کوئی نہ کوئی روایت مروی نہ ہو۔

امام زہری پر لگائے گئے الزامات کی حقیقت:

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس سے امام زہری کے علمی مرتبہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کسی ایک بھی عالم نے امام زہری کی امانت و دیانت اور علمی مرتبہ پر شک نہیں کیا ہے، گولڈ زیہر پہلا شخص ہے جس نے امام موصوف پر الزام تراشی کی ہے۔

امام صاحب اور اموی حکومت کے درمیان باہمی روابط کو بنیاد بنا کر موصوف نے یہ الزام لگایا ہے کہ امویوں نے امام صاحب کو وضع حدیث کے لئے استعمال کیا۔

مگر یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ان روابط کو اس بات کی علامت کیسے سمجھ لیا گیا کہ امام صاحب سے امویوں نے حدیثیں وضع کروائیں، جبکہ اس سے پہلے بھی بہت سے علماء اور خلفاء کے درمیان روابط رہے ہیں، اور اس سے کبھی ان کی امانت پر کوئی اثر نہیں پڑا، پھر اس بات کو بنیاد بنا کر امام زہری کو مطعون کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، اور پھر جبکہ یہ بات بھی ذہن میں رکھی جائے کہ امام صاحب خلفاء کے پاس کسی دنیوی مقصد سے نہیں جاتے تھے بلکہ کسی مسئلہ کی وضاحت کرنے، یا حدیث سنانے یا ان کی اولاد کی تربیت و تادیب کے لئے یا انہیں ان کے فرائض و واجبات یاد دلانے کے لئے ہی آپ جاتے، تو اس بہتان کی حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے۔

امام زہری اور امویوں کے درمیان تعلق کس نوعیت کا تھا:

العقد الفرید میں ہے کہ ''زہری ولید بن عبدالملک کے پاس آئے، ولید نے ایک حدیث کے بارے میں پوچھا، وہ حدیث یہ تھی کہ ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو رعایا کا بادشاہ بنا دیتا ہے تو پھر اس کے لئے صرف حسنات لکھی جاتی ہیں، برائیاں نہیں لکھی جاتیں، امام زہری نے فرمایا کہ یہ حدیث باطل ہے، جھوٹی ہے، کیوں کہ قرآن میں حضرت داؤد کے بارے میں ہے یا داؤد إنا جعلناك خليفة فى الأرض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله،

إن الذين يضلون عن سبيل الله لهم عذاب شديد بما نسوا الحساب۔ اس میں خلیفہ اور بادشاہ کے لئے وعید ہے اور ایسے خلیفہ کے لئے جو نبی بھی ہیں، پھر جو خلیفہ نبی نہ ہو اس کے بارے میں کیا خیال ہے، ولید نے کہا: کہ یہ لوگ ہمیں دین کے بارے میں گمراہ کر رہے ہیں۔''

اس واقعہ کی روشنی میں آپ اندازہ کرئے کہ کیا امام زہری کا موقف لچک دار، کمزور اور تملقانہ ہے، اور کیا امام صاحب خلفاء کی خواہشات کے آگے جھک رہے ہیں؟ یا ایک خیر خواہ اور بے باک عالم کی طرح نصیحت کر رہے ہیں، اور وضاعین کی ایک حدیث کی تردید کر رہے ہیں۔''

ابن عساکر نے امام شافعی کے واسطہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ: ''ہشام بن عبدالملک نے سلیمان بن یسار سے والذی تولی کبره منهم له عذاب عظيم کے بارے میں پوچھا کہ اس میں کس کی طرف اشارہ ہے، سلیمان بن یسار نے فرمایا کہ عبداللہ بن ابی بن سلول مراد ہے، ہشام نے کہا کہ تم نے غلط کہا، اس سے مراد علی بن ابی طالب ہیں (بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ہشام نے یہ بات سنجیدگی سے نہیں کہی تھی، محض یہ دیکھنے کے لئے ایسا کہا کہ یہ لوگ حق پر کتنے مضبوط ہیں) تو سلیمان نے کہا کہ امیر المومنین زیادہ جانتے ہیں جو وہ کہہ رہے ہیں، پھر یہی سوال ہشام نے امام زہری سے کیا، آپ نے بھی فرمایا کہ اس سے مراد عبداللہ بن أبی ہے، ہشام نے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، اس سے مراد علیؓ ہیں، یہ سننا تھا کہ امام صاحب کا پارہ چڑھ گیا، اور غصہ میں بولے تیرا ستیاناس ہو، کیا میں جھوٹ بولتا ہوں؟ قسم بخدا اگر آسمان سے بھی یہ نداء آئے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ کو حلال کر دیا ہے تب بھی میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ پھر آپ نے اپنی سند سے پوری روایت بیان کی کہ اس سے مراد عبداللہ بن أبی ہی ہے۔''

یہ واقعہ آٹھ صدیوں سے بھی زیادہ سے تاریخ ابن عساکر میں موجود ہے، اور امام شافعی جیسے سچے، متدین اور راست باز عالم کی یہ گواہی اس وقت کی ہے جبکہ زہری پر تہمت لگانے والے کا وجود بھی نہیں تھا۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلفاء سے امام زہری کا تعلق کس نوعیت کا تھا، صرف اتنی سی بات سن کر کہ ہشام نے آپ پر جھوٹ کا الزام لگایا امام صاحب غصہ میں لال پیلے ہو جاتے ہیں اور بادشاہ سے اس طرح کا ایک جملہ کہتے ہیں جو ایک عام آدمی کے احترام کے بھی منافی ہے لا أبا لك کہ تیرا ستیاناس ہو، کیا جو شخص خلیفہ سے اس طرح کا جملہ کہہ سکتا ہے وہ اس کی چاپلوسی میں جھوٹی حدیثیں وضع کرے گا؟ آیت کی غلط تفسیر سن کر جو خلیفہ کے سامنے شیر کی طرح دہاڑنے لگتا ہے کیا وہ خود اللہ کے رسول پر جھوٹ بول سکتا ہے؟

اور پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کرنے کے دو ہی مقصد ہو سکتے تھے، یا تو مال وزر کی تحصیل یا جاہ ومنصب کی طلب، اور یہ مستشرق خود اس بات کا قائل ہے کہ امام صاحب نہ پیسہ کے غلام تھے اور نہ جاہ کا انہیں لالچ تھا کہ پہلے سے ہی انہیں خوب عزت وشہرت حاصل تھی، آخر جب امام صاحب پیسوں کے بھی حریص نہیں اور جاہ ومنصب کا بھی انہیں لالچ نہیں تو یہ گھٹیا کام کیوں کرنے لگے؟ ہے کوئی دلیل!!!

اگر ایسا ھی تھا تو پھر علماء مدینہ نے زھری کی مخالفت کیوں نہ کی؟: یہ مستشرق بنوامیہ کے دور کو جور وستم اور ظلم وزیادتی کا دور قرار دیتا ہے، اور یہ بھی دعوی کرتا ہے کہ علماء مدینہ بنوامیہ سے جنگ و جدال کرتے اور ان کی مخالفت کرتے، اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ امام زہری مدینہ میں پلے بڑھے اور سعید بن مسیّب جیسے جلیل القدر تابعی سے کسب فیض کیا، اور امام مالک جب بھی مدینہ آتے امام زہری سے اکتساب فیض کرتے، اور خود امام زہری مدینہ اور شام ۳۵ سال آتے جاتے رہے، سوال یہ ہے کہ اگر امام زہری امویوں کے لئے حدیثیں وضع کررہے تھے تو پھر علماء مدینہ نے ان کی مخالفت کیوں نہ کی؟ سعید بن مسیّب نے انہیں اپنی مجلس میں کیسے بیٹھنے دیا، جبکہ سعید بن مسیّب تو عبدالملک جیسے فرمانروا کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے، تو امام زہری جیسے جھوٹے اور وضاع کو کیسے برداشت کرلیا؟ علماء مدینہ نے ان پر نقد کیوں نہ کیا؟ کس بات کا انہیں خوف تھا؟ وہ تو جرح وتنقید میں بڑے سے بڑے بادشاہ کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔

اور اگر فرض کرلیا جائے کہ ڈر کی وجہ سے علماء مدینہ امام زہری کے بارے میں کچھ کہنے سے گریز کرتے رہے تو سوال یہ ہے کہ جب اموی حکومت ختم ہوگئی اور امام زہری کو اموی حکومت کی جو پشت پناہی حاصل تھی وہ بھی جاتی رہی تو پھر دولت عباسیہ کے زمانہ میں علماء نے ان پر تنقید کیوں نہ کی؟

وہ کبار علماء جرح وتعدیل جو کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرتے تھے کیوں امام زہری پر تنقید کرنے سے خاموش رہے؟

کیا ان کی خاموشی بلکہ امام موصوف کی شان میں ان کی ثناخوانی اس بات کی دلیل نہیں کہ امام صاحب ہر شک وشبہ سے بالاتر اور جھوٹ کے ادنی شائبہ سے بھی پاک تھے۔

عبدالملک کے تعمیر کردہ قبۃ الصخرہ کی فضیلت میں حدیثیں گھڑنے کا الزام اور اس کی حقیقت:: محترم نے ایک الزام یہ لگایا ہے کہ عبدالملک بن مروان نے فتنۂ عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانہ میں لوگوں کو حج بیت اللہ سے روکا اور مسجد اقصی میں ایک چبوترہ (قبۃ الصخرہ) تعمیر کرایا اور خانۂ کعبہ کے بجائے اس کا حج کرنے پر لوگوں کو آمادہ کیا، اپنے اس مقصد کو دینی رنگ دینے کے لئے امام زہری کو استعمال کیا اور امام موصوف نے فوراً حدیثیں گھڑ دیں کہ ''لا تشد الرحال إلا إلی ثلاثة مساجد، مسجدی هذا، والمسجد الحرام، والمسجد الأقصی، اور الصلاة فی المسجد الأقصی تعدل ألف صلاة فیما سواه۔

عبدالملک کے قبہ صخرہ تعمیر کرانے اور امام زہری کی طرف سے اس کے حج کرنے کی تائید میں حدیث گھڑنے کا الزام تو تحریف وافتراء کی نہایت گھناؤنی مثال ہے، اس میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ قبۃ الصخرہ کی تعمیر کی نسبت ہی عبدالملک کی طرف غلط ہے، ابن عساکر، طبری، ابن اثیر، ابن خلدون اور ابن کثیر جیسے ثقہ مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ قبہ کی تعمیر ولید بن عبدالملک نے کی تھی، پھر مؤرخین کا معمول رہا ہے کہ وہ ہر اہم بلکہ غیر اہم چیزوں کا بھی ذکر کرتے ہیں مگر اس بات کا

ذکر کسی نے نہیں کیا کہ عبدالملک نے لوگوں کو قبہ کا حج کرنے پر ابھارا تھا، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ کسی بھی مؤرخ کے نزدیک قبہ کی تعمیر کرانے والا عبدالملک ہے ہی نہیں، اور نہ ہی اس نے ایسا کیا، ہاں البتہ دمیری نے کتاب الحیوان میں اس کی نسبت عبدالملک کی طرف کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ لوگ عرفہ کے دن قبہ کے پاس وقوف کرتے تھے، مگر

اولاً: دمیری کی روایت قابل قبول ہی نہیں کہ تمام ثقہ مؤرخین کی روایت کے خلاف ہے۔

ثانیاً: اس میں بھی یہ ذکر نہیں کہ لوگ اس کا حج کرتے تھے۔

ثالثاً: وقوف کا ذکر ہے مگر دمیری کی روایت میں بھی اس کی کہیں صراحت نہیں کہ وہ ایسا عبدالملک کے حکم سے کرتے تھے، بلکہ یہ لوگ خود اپنی مرضی سے ایسا کرتے ہوں گے۔

رابعاً: عرفہ کے دن قبہ کے پاس وقوف کرنا قبہ کے ساتھ ہی خاص نہ تھا، بلکہ بہت سے دوسرے شہروں میں بھی حجاج کی مشابہت اختیار کرنے کی غرض سے لوگ باہر کسی میدان میں آکر عرفہ کے دن جمع ہوجایا کرتے تھے، اور فقہاء نے اس کو بھی مکروہ قرار دیا تھا۔

۲۔ کعبہ کے علاوہ کسی اور عمارت کی طرف حج کرنا یا کرنے کا حکم دینا کفریہ عمل ہے، اور عبدالملک کے جو اوصاف پیچھے ہم ذکر کر چکے ہیں جو خود موصوف مستشرق نے ذکر کئے ہیں ان کی رو سے یہ بالکل بعید ہے کہ وہ ایسا کفریہ عمل کرے، اور اگر ایسا کیا ہوتا تو اس کے مخالفین ضرور اس پر طعن کرتے مگر کسی کا طعن منقول نہیں۔

۳۔ زہری کی پیدائش ۵۱ھ کی ہے اور دوسری روایت کے مطابق ۵۸ھ ہے، اور عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت ۷۳ھ میں ہوئی، اس حساب سے اس وقت امام صاحب کی عمر پہلی روایت کے مطابق ۲۲ اور دوسری روایت کے مطابق پندرہ سال ہوتی ہے، کیا عقل اس بات کو قبول کرسکتی ہے کہ امام صاحب کو اتنی کم عمری میں ایسی مقبولیت اور شہرت نصیب ہوچکی تھی کہ آپ کی وضع کردہ ایک حدیث قبول عام حاصل کرلے، اور اس جرأت بے جا پر سب خاموش رہیں۔

۴۔ تاریخ بتاتی ہے کہ شہادت عبداللہ بن زبیر تک امام زہری نے عبدالملک کو دیکھا بھی نہ تھا، ذہبی کے مطابق امام صاحب پہلی مرتبہ عبدالملک کے پاس ۸۰ میں آئے تھے، اور ابن عساکر کے مطابق ۸۲ میں، یعنی فتنۂ ابن زبیر کے چند سالوں بعد امام صاحب کا عبدالملک سے تعارف ہوا اور اس وقت امام صاحب جوان تھے کہ عبدالملک نے آپ کا امتحان بھی لیا اور یہ نصیحت کی کہ انصار کے یہاں جاکر علم حاصل کریں۔

۵۔ "لا تشد الرحال" والی حدیث زہری کے علاوہ دوسرے بھی کئی طرق سے مروی ہے، امام بخاری نے یہ روایت زہری کے علاوہ کسی اور سند سے ابوسعید خدریؓ سے روایت کی ہے، امام مسلم نے یہ حدیث تین طرق سے روایت کی ہے، جن میں صرف ایک سند امام زہری کی ہے، دوسری جریر عن ابن عمیر عن قزعہ عن أبی سعید، اور تیسری عن أبی وھب عن عبدالحمید بن جعفر عن عمران بن أبی أنس عن سلمان الأغر عن أبی ھریرہ سے۔ ابن تیمیہ جو زیارت قبور کے لئے سفر کرنے کے بھی قائل نہیں مگر وہ بھی صحیحین کی اس حدیث کی وجہ سے بیت المقدس کی زیارت

کے قائل ہیں۔

۶۔ زہری نے یہ حدیث سعید بن میسّب سے روایت کی ہے، اگر زہری نے یہ حدیث وضع کی ہوتی تو سعید خاموش کیسے رہ سکتے تھے؟ جبکہ وہ شہادت عبداللہ بن زبیر کے ۲۰ سال بعد تک حیات رہے، اور امویوں کی طرف سے انہیں ایذاء بھی برداشت کرنا پڑی تھی، ان کے پاس موقع تھا کہ اس حدیث کی حقیقت واضح کر کے امویوں سے بدلہ لے لیں۔

۷۔ فرض کر لیں کہ زہری نے اس حدیث کو عبدالملک کو خوش کرنے کے لئے وضع کیا تھا، مگر سوال یہ ہے کہ پھر اس میں قبۃ الصخرہ کی صراحت کیوں نہ کی؟ جبکہ مقصود اسی کا حج کرنا تھا، اس میں تو صرف مسجد اقصی میں نماز پڑھنے کی فضیلت کا بیان ہے، اور قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جب گھڑنا ہی تھی تو صاف صاف قبہ کے حج کی فضیلت کے متعلق حدیث گھڑی جاتی۔

۸۔ بیت المقدس اور صخرہ کی فضیلت پر دلالت کرنے والی بہت سی حدیثیں ہیں جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ اور وہ امام زہری کی اس روایت علاوہ ہیں، ان میں کہیں بھی زہری کا نام نہیں، لیکن جہاں تک زیر بحث حدیث کی بات ہے تو محدثین نے اس کی تصحیح کی ہے اور یہ کہا ہے کہ بیت المقدس کی فضیلت پر دلالت کرنے والی حدیثوں میں صرف تین ہی حدیثیں صحیح ہیں۔ ان میں ایک یہی ہے، دوسری سئل عن أول بيت وضع في الأرض قال: المسجد الحرام، قيل: ثم ماذا؟ فقال: المسجد الأقصى ،اور تیسری إن الصلاة فيه تعدل سبع مائة صلوة في غيره"۔

ابراہیم بن ولید اموی اور اس کے صحیفہ والے واقعہ کی حقیقت!

موصوف مستشرق نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ابراہیم بن ولید اموی صحیفہ لے کر امام زہری کے پاس آیا، اس میں اس نے خود سے کچھ حدیثیں لکھ رکھی تھیں، امام زہری نے اسے اس صحیفہ سے روایت کرنے کی اجازت دے دی اور یہ کہا کہ میرے علاوہ اور کون تمہیں ان کی روایت کی اجازت دے سکتا ہے، اس طرح اسے اختیار مل گیا کہ امام زہری کے حوالہ سے خود اپنی لکھی ہوئی حدیثوں کو روایت کر سکے، اس میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔

ا۔ ابن عساکر نے ابراہیم کے زہری سے سماعت کرنے کی صراحت کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ابراہیم نے اپنے شیخ زہری کے سامنے اپنا ایک صحیفہ پیش کیا جو پہلے ان سے سماعت کر چکا تھا، اسے محدثین کی اصطلاح میں ''عرض المناولۃ'' کہتے ہیں، یعنی کوئی شاگرد اپنے شیخ سے کچھ روایات سنے پھر انہیں لکھ کر شیخ کے سامنے پیش کرے اور شیخ اسے ان کی روایت کی اجازت دے دے، امام مالک، ربیعہ، یحیی بن سعید، مجاہد اور سفیان بن عیینہ وغیرہ بہت سے محدثین اس طریقہ کو سماع پر ہی محمول کرتے ہیں، ابراہیم نے بھی ایسا ہی کیا تھا، روایت میں عرض کے لفظ کی صراحت ہے، جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ شیخ صحیفہ دیکھ کر روایت کرنے کی اجازت دے اور امام زہری کے بہت سے شاگردوں نے اس طرح اپنے شیخ سے روایت کی اجازت لی تھی، اور موصوف نے جو الزام لگایا ہے وہ تو امام زہری جیسی عظیم شخصیت سے ممکن ہی نہیں کہ آپ

کی امانت وسچائی مسلّم ہے۔

۲۔ زہری کے اس جملہ میں ''کہ تمہیں میرے علاوہ اور کون انہیں روایت کرنے کی اجازت دے سکتا ہے'' کوئی قابل اعتراض بات ہے ہی نہیں، کیوں کہ زہری کے شاگردوں نے جو روایات زہری سے سنی ہوں انہیں روایت کرنے کی دوسرا کوئی کیسے اجازت دے سکتا ہے، اور یہ بات گزر چکی ہے کہ امام زہری اپنے زمانہ کے حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے، بہت سی حدیثیں دوسروں کو یاد نہیں تھیں مگر امام زہری ان سے بھی واقف تھے، اس جملہ سے یہ مطلب نکالنا کہ میرے علاوہ تمہیں وضع حدیث کی اور کون اجازت دے سکتا ہے دھاندلی کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔ ابراہیم بن ولید کا تذکرہ کتب جرح وتعدیل میں کہیں بھی نہیں، اور نہ ہی اس کے صحیفہ یا اس کی مرویات کا کسی کتاب میں ذکر ہے، سوال یہ ہے کہ زہری سے روایت کر کے اس نے جو جھوٹی حدیثیں پھیلائیں وہ کہاں چلی گئیں؟

زہری کے قول ''أکرھونا علی کتابة الأحادیث'' کی حقیقت!: امام زہری نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ أکرھونا ھؤلاء الأمراء علی کتابة الأحادیث یعنی ''ہمیں امراء نے حدیثیں لکھنے پر مجبور کیا'' اس جملہ کو موصوف نے اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا امراء نے ہمیں زبردستی حدیثیں وضع کرنے اور گھڑنے پر مجبور کیا، مگر یہ تاریخی اور علمی خیانت ہے۔ ابن عساکر اور ابن سعد وغیرہ نے جو پورا واقعہ نقل کیا ہے اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ امام صاحب اپنے شاگردوں کو حدیثیں لکھواتے نہیں تھے، تاکہ وہ اپنے حافظہ پر بھروسہ کریں، مگر ہشام نے ان سے اپنے لڑکے کے لئے حدیثیں لکھوائیں، پھر اس کے بعد امام صاحب دوسروں کو بھی لکھوانے لگے، یہی مطلب ہے امام صاحب کے اس جملہ کا کہ ہم حدیثیں ذہن میں رکھنا پسند کرتے تھے، ان کو لکھنا ہمیں پسند نہ تھا، مگر ان امراء کی وجہ سے ہم نے لکھنا شروع کر دیا''۔

دونوں مفہوموں میں کتنا فرق ہے!!! اور مستشرق موصوف نے کس طرح ایک سیدھے سادھے جملہ کو غلط معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔

زہری کا شاہی محل جانا اور بادشاہ کے ارد گرد حرکت کرنا: امام زہری کا خلفاء سے میل جول تھا، آپ شاہی محل محل بھی جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی خلیفہ کے ساتھ بھی رہتے تھے، مگر موصوف نے اسے وضع حدیث کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، مگر یہ بات کہ امام صاحب شاہی جاتے تھے ذرا بھی قابل طعن نہیں، صحابہ وتابعین اور خاص کر امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف تو خوب امراء وخلفاء کے پاس جایا کرتے تھے، مگر کسی نے بھی ان پر طعن نہیں کیا، اور امام زہری جاتے ضرور تھے مگر کبھی بھی ان کی غلط خواہشات کے آگے جھکتے نہ تھے بلکہ حق کا برملا اعتراف کرتے تھے جیسا کہ گذر چکا ہے۔

حجاج بن یوسف ثقفی کے ساتھ حج کرنا: اسی طرح موصوف نے ذکر کیا ہے کہ حجاج ثقفی نے جب حج کیا تو امام صاحب اس کی معیت میں تھے، مگر موصوف نے اس روایت کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے، اس

واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب حج کے موقع پر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور حجاج بھی حضرت ابن عمر کے ساتھ تھا۔ تو دونوں (زہری اور حجاج) حضرت ابن عمر کی معیت میں حج کر رہے تھے نہ یہ کہ امام زہری حجاج کی معیت میں، مگر ہائے رے خیانت!

ہشام کی اولاد کی اتالیقی

ہشام نے آپ کو اپنی اولاد کا اتالیق مقرر کیا تھا اسے بھی موصوف نے وجہ طعن کے طور پر پیش کیا ہے، مگر موصوف نے جو اعتراض کیا ہے اس میں اولاً تو ایک تاریخی غلطی کی ہے کہ امام صاحب ہشام کے ولی عہد کے اتالیق مقرر ہوئے، جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ امام صاحب ہشام کے لڑکوں کے اتالیق تھے نہ کہ اس کے ولی عہد کے، اس کا ولی عہد اس کا بھتیجا ولید بن یزید تھا۔

اور امام صاحب کا ان کا اتالیق بننا اس سے بدرجہا بہتر تھا کہ ان کی تربیت گمراہ اور بدترین لوگ کرتے، لہذا اگر امام زہری نے اس کے لڑکوں کی تربیت کی ذمہ داری لے بھی لی تو آخر اس میں قباحت کیا ہے؟

آگے چل کر اولاد ہشام نے روم کی فتوحات میں جو کارنامے انجام دئے کیا اس میں امام زہری کی اسی تربیت کا اثر نہیں ہے؟

منصب قضا کا قبول کرنا

امام زہری نے یزید ثانی کے عہد میں منصب قضا قبول کر لیا تھا، موصوف مستشرق نے اسے بھی وجہ طعن قرار دے ڈالا ہے، اور یہ حدیث بھی پیش کی ہے کہ جس نے قضا کا عہدہ قبول کر لیا گویا اسے بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔

اگر امام صاحب نے قضا کا منصب قبول کر لیا تو آخر اس میں وجہ طعن کیا ہے؟ جبکہ صحابہ تابعین اور علماء ومحدثین کی ایک بڑی تعداد منصب قضا پر فائز رہی ہے مگر اس سے ان کی عدالت وثقاہت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔

کچھ حضرات نے انکار بھی کیا، مگر اس وجہ سے نہیں کہ اس سے عدالت وثقاہت پر کچھ فرق پڑتا بلکہ اس عہدہ کی سنگینی اور اہمیت کی وجہ سے، کہ صحیح طور سے اسے انجام دینا بڑا مشکل ہے، امام اعمش نے اگر چہ قضا کے عہدہ سے انکار کر دیا تھا مگر بعد میں انہوں نے بھی قبول کر لیا تھا۔

جہاں تک اس حدیث کی بات ہے کہ ''جس نے قضا کا عہدہ قبول کر لیا تو گویا بغیر چھری کے اسے ذبح کر دیا گیا'' تو اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ اس کا قبول کرنا ناجائز وحرام ہے۔ بلکہ تمام علماء کے نزدیک یہ بالکل جائز ہے، مگر اس عہدہ کی سنگینی کے پیش نظر تعبیر یہ اختیار کی گئی کہ قضا کا عہدہ آسان نہیں بلکہ یہ خطروں سے بھری راہ ہے، بڑا مشکل ہے کہ کوئی اسے صحیح سے انجام دے سکے، اور جس نے قبول کر لیا پھر اس کا حق ادا نہ کیا تو گویا اس نے خود کو ہلاک کر دیا۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ مستشرق موصوف نے امام زہری پر جو الزامات لگائے تھے وہ بالکل بے بنیاد اور علمی خیانت پر مبنی تھے، مقصد اس کا یہ تھا کہ امام زہری چونکہ مدون اول ہیں جب ان پر ہی سے اعتماد اٹھ جائے گا تو پھر حدیث کا ذخیرہ بھی قابل اعتبار نہ رہے گا۔ مگر مذکورہ تفصیلات نے ان الزامات کو ھباء منثورا کر دیا۔

(السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی)

☆☆☆

نقطۂ نظر

کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی.....ریسیور اٹھایا تو آواز آئی:

''میں شیلینڈر بول رہا ہوں، انٹلیجنس ڈپارٹمنٹ سے، سعودی سفارت خانہ نے حکومت سے شکایت کی ہے کہ آپ مملکت سعودی عرب پر تنقید کرتے ہیں اور آپ کی تنقیدیں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں''۔

میں نے جواب میں کہا:

''شیلینڈر صاحب! آپ تو جانتے ہیں ہم لوگ جمہوری ملک میں رہتے ہیں، یہاں تو لوگ اور اخبارات والے وزیر اعظم پر بھی تنقید کیا کرتے ہیں، کیا سعودی سفارت خانہ نے ہندوستان کو سعودی عرب سمجھ رکھا ہے، جہاں لوگوں کو بولنے لکھنے اور اظہارِ خیال کی آزادی حاصل نہیں اور جہاں ہر شخص منقارِ زیر پر بنا رہتا ہے''۔

حکومت پر اور حکمراں پر تنقید کا حق اس دور میں دنیا کے بیشتر ملکوں میں لوگوں کو حاصل ہے اور ہندستان میں بھی یہاں کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے۔ یہاں حکومت میں ایک ہزار خرابیاں ہوسکتی ہیں لیکن حاکم پر تنقید اور اس سے اختلاف کے حق تک یہ نظام اسلام کے دیئے ہوئے حقوق کے عین مطابق ہے۔ سعودی عرب میں ایک ہزار اچھائیاں ہوسکتی ہیں لیکن یہ استبدادی نظام جس میں حکومت پر تنقید کا حق کسی کو حاصل نہ ہو بالکل غیر اسلامی ہے اور اسلام کا نظام اس جبر اور زبان بندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس پابندی کی حد تک سعودی حکومت کا نظام یقینی طور پر غیر اسلامی ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام میں ایک فرد کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ حکمراں کا احتساب کرے یا اربابِ حکومت پر تنقید کرے۔ حکمراں اگر غلطی کرے تو اسے متنبہ کرنا اور منکر پر نکیر کرنا ضروری ہے حضرت ابوبکرؓ نے بیعت خلافت کے بعد لوگوں کے سامنے تقریر کی تو یہ الفاظ کہے: **فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقوّمونی** (کنز العمال ج ۵، ۳۴۹) یعنی اگر میں درست طریقہ اختیار کروں تو میری معاونت کرو اور اگر میں غلط راستہ پر چلوں تو مجھے سیدھا کردو۔

ایک بار حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا اگر تم میرے

اندر کوئی کجی دیکھو گے تو کیا کرو گے ایک شخص نے صاف طور پر کہا ''ہم اپنی تلوار کی دھار سے سیدھا کر دیں گے'' اس پر حضرت عمر نے فرمایا ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے عمر کی رعایا میں ایسے افراد کو رکھا ہے جو اس کی کجی کو اپنی تلواروں کی دھار سے سیدھا کر سکتے ہیں''۔

حضرت عمرؓ ہی کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ اس حال میں خطبہ دے رہے تھے کہ ان کے جسم پر دو یمنی چادریں تھیں۔ اچانک حضرت سلمان فارسیؓ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: واللہ ہم آپ کی بات نہیں سنیں گے، آپ پہلے یہ بتائیے کہ مال غنیمت میں جو یمنی چادریں آئی ہیں ان میں سے جب ہر ایک کے حصہ میں ایک چادر ہی آئی ہے تو آپ کے جسم پر دو چادریں کیوں ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ سے گواہی دلوائی کہ دوسری چادر ان کی ہے جسے ان کے باپ نے ان سے مانگ لی تھی، تب سلمان فارسیؓ بولے: ''ہاں اب فرمائیے ہم سنیں گے اور آپ کی اطاعت کریں گے''۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے خلیفہ حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہا: اللہ سے ڈرو اور پھر اس نے زبان تنقید دراز کی۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اسے روکا اور کہا: بس کرو، بہت ہو گیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا اسے کہنے دو۔ اگر یہ لوگ نہ کہیں گے تو یہ بے مصرف ہیں اور ہم نہ مانیں گے تو ہم بے مصرف ہیں (ابو یوسف کتاب الخراج)

اسلام کے سیاسی نظام میں حاکم اور امیر کا انتخاب ہوتا ہے۔ اسلام کے نظامِ حکومت میں ایک فرد کو حکمراں پر تنقید کرنے اور اس سے باز پرس کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اسلام کے نظامِ خلافت میں بیت المال خلیفہ کی جاگیر نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ صرف اس کا متولی ہوتا ہے، اس کی شخصی آمدنی اور خرچ پر بھی لوگوں کو احتساب کا حق حاصل ہوتا ہے۔

احتساب کی روح پورے طور پر تو خلافت راشدہ کے زمانہ میں جلوہ گر رہی، لیکن مکمل طور پر مردہ کبھی نہیں ہوئی۔ اسلام کی تاریخ میں اس کے نمونے بار بار ملتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں سینکڑوں واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ روحِ احتساب اپنا کام کرتی رہی ہے۔ یزید کے خلاف حضرت امام حسین کا اقدام، اموی حکومت کے خلاف حضرت عبد اللہ بن زبیر کا اقدام، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کا ظالم حکمرانوں کو برسر منبر ٹوکنا، شیخ الاسلام عزالدین بن سلام کا ان امرائے سلطنت کو بازار میں نیلام کروا دینا جو شرعی طور پر آزاد نہیں کیے گئے تھے، حضرت امام ابوحنیفہ کا استبدادی نظام الٹنے کی کوشش میں حضرت زید بن علی کا ساتھ دینا، خلیفہ منصور کے زمانہ میں ظالم حکومت کے خلاف نفس ذکیہ کے بھائی جناب ابراہیم کا علم بغاوت بلند کرنا اور امام ابوحنیفہ کا ان کا ساتھ دینا، امام مالک کا جن کا لقب امام دارالہجرۃ ہے محمد بن عبداللہ ذوالنفس الذکیہ کا ساتھ دینا جو خلیفہ عباسی کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور یہ جرأت مندانہ فتوی دینا کہ زبردستی کی بیعت کا اعتبار نہیں، مامون رشید کے مذہب اعتزال پر امام احمد بن حنبل کا نکیر کرنا اور احتساب کرنا، امام ابو یوسف کا عدالت کے بھرے اجلاس میں خلیفہ کے وزیر کو مردود الشہادۃ قرار دینا وغیرہ ان جیسے احتساب کے واقعات سے اسلام کی پوری تاریخ بھری ہوئی

ہے اور حکمراں پر احتساب اور منکر پر نکیر سے اسلامی تاریخ کا کوئی عہد پورے طور پر کبھی خالی نہیں رہا۔ لیکن افسوس اب یہ زمانہ آ گیا ہے کہ دینی اداروں کے سربراہ بزدلی اور دولت پرستی کے وائرس کا شکار ہو گئے ہیں اور ناانصافی کا رویہ اختیار کرنے کے لیے رشوتیں قبول کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی حق گوئی کی سزا دیتے ہیں اور ایک کفِ جو کے عوض ضمیر کو فروخت کر رہے ہیں اور حق کی شمع روشن کرنے کے بجائے مداہنت سے کام لیتے ہیں۔

ایسے وقت میں جب عالم اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا رہی تھی، جب کارپٹ بمباری سے پہاڑوں پر رعشۂ سیماب طاری ہو گیا تھا، جب بعض مسلم ملکوں میں جوئے خون سروں کے اوپر سے گزر رہی تھی، جب اغیار کی سازش سے جائز اور جمہوری حکومتوں کے تختے الٹے جا رہے تھے اور جب اس سازش میں ''بڑے پاک طینت بڑے صاف باطن'' قسم کے مسلم حکمراں بھی پورے طور پر شریک ہو گئے تھے، جب اسرائیل امریکہ کے اسلحہ سے ظلم کا پہاڑ توڑ رہا تھا اور جب **اذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر** کا منظر سامنے آ گیا تھا اس وقت دینی مدارس کے کچھ باحمیت اہل قلم اور اہل زبان علما تھے جنہوں نے کسی علمی جزیرہ میں بیٹھ کر درخت کے نیچے تحقیق کی بانسری بجانے یا ادب کا راگ الاپنے کے بجائے تحریر سے یا تقریر سے لوگوں کو جھنجھوڑنے اور ضمیر کو آواز دینے کا کام کیا۔ انہوں نے ''حالات بدل سکتے ہیں'' اور ''عالم اسلام خون سے لالہ زار'' اور عرب انقلابات اور شام ومصر کے حالات کے موضوع پر کتابیں لکھیں یا بعض علماء نے تقریریں کیں اور ان کی آتش نوائی اور شعلہ بیانی یوٹیوب پر بھی موجود ہے اور ان اہل قلم سے جو صرف علمی نکتہ آفرینی اور شعروادب کے دائرہ میں محبوس تھے انہوں نے صاف کہہ دیا:

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد درد تنہا مرا غم غمِ زمانہ

کیا اس وقت عالم اسلام کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ اور سرزمین فلسطین کی بازیابی کے لیے سروں کو ہتھیلی پر لے لے اور جان کی بازی لگا دے، اگر اس وقت جب ایک باحمیت شخص یہ دیکھتا ہے سرزمین فلسطین کے گردوپیش جو ریاستیں اور حکومتیں ہیں ان کے حکمراں غیرت ایمانی سے خالی اور عیش وعشرت کے دلدادہ ہیں۔ جب وہ دیکھتا ہے عرب حکومتیں دینی تحریکات کو دہشت گرد قرار دے رہی ہیں اور شام میں بشار الاسد اور ایران کے ظلم سے عوام کو نجات دلانے کے لیے کچھ نہیں کر رہی ہیں اور اپنے مجاہدین کو بھی وہاں سے واپس بلانے کا حکم دے رہی ہیں او رمصر میں ظالموں کی پشت پناہی کر رہی ہیں تو اس کا خون کھولتا ہے۔ وہ ان حکمرانوں کو اس عقاب کے مانند دیکھنا چاہتا ہے جو پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرتا ہے۔ وہ انہیں صلاح الدین ایوبی کی طرح دیکھنا چاہتا ہے جسے تھوڑے عرصہ کے لیے مسجد اقصیٰ کے ہاتھ سے جانے کا ایسا غم تھا جیسے اس کا اکلوتا بیٹا مر گیا ہے۔ جب تک یہ غم نہ ہوگا فلسطین دوبارہ حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔

لوگ خوش ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس، عرب

حکومتوں کے پاس اور خلیجی ریاستوں کے پاس پٹرول کی دولت ہے۔لیکن دولت کس کام کی ہے۔اگر اس سے مسجد اقصیٰ کی بازیابی ممکن نہ ہو، وقار وعزت کی بازآفرینی نہ ہو، دولت کے زبردست ذخیرہ اور قارون کے خزانہ کے باوجود مسلمانوں کی عزت پامال ہے،اور اسرائیل اتنا طاقتور ہے کہ موجودہ عرب طاقتیں سب مل کر اس کا بال بیکا نہیں کرسکتی ہیں۔فلسطین کو واگزار کرنے کے لیے تو زبردست منصوبہ بندی کی اور منصوبہ بندی سے پہلے غم کی ضرورت ہے،غم گہرا نہیں ہوگا تو منصوبہ بندی کیسے ہوگی؟ منصوبے تو فکر واضطراب سے پیدا ہوتے ہیں۔

حرمین شریفین کی خدمت کی نسبت جنہیں حاصل ہے، انہیں تو طائر بلند بام ہونا تھا، وہ امریکہ اور یورپ کے دانہ ودام کا شکار کیسے ہوگئے۔سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کو پٹرول کے بدلہ امریکہ سے صرف اتنے ہی اور صرف اسی معیار کے اسلحے مل سکتے ہیں جسے اسرائیل منظور کرلے۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی اسرائیل کی مرضی سے تیار ہوتی ہے۔ اسرائیل کتنا بھی ظلم کرے، بیروت کے پناہ گزین کیمپوں میں صابرہ اور شتیلہ میں قتل عام کرے، غزہ میں ہزاروں فلسطینیوں کو خاک وخون میں ملادے، مقبوضہ علاقہ میں لوگوں کو تہہ تیغ کردے، امریکی کانگریس میں مذمت کی ایک تجویز پاس نہیں ہوسکتی ہے۔امریکہ میں اسرائیل کی لابی اتنی مضبوط ہے کہ وہ جدید ترین اور خطرناک ترین ہتھیار جن کا پروڈکشن ابھی شروع ہوا ہے اور جو ابھی امریکی فوجوں کے پاس بھی نہیں پہونچے ہیں وہ اسرائیل کے پاس پہونچ جاتے ہیں۔امریکہ کی وہ مالی امداد، اربوں ڈالر کی خیرات جو ساری دنیا میں تقسیم ہوتی رہتی ہے،اس کا ایک تہائی حصہ صرف اس اسرائیل کو ملتا ہے جس کا ابتدائی اولین رقبہ ۱۵ کیلو میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔اسرائیل کو اربوں کھربوں ڈالر کی فوجی امداد ملتی ہے اور اسی کے بقدر اقتصادی امداد ملتی ہے اور اسی کے بقدر اس کو قرضے دیے جاتے ہیں اور پھر ان قرضوں کو معاف کردیا جاتا ہے۔اسرائیل کو امریکہ کی طرف سے سادہ چیک دے دیا گیا ہے کہ جتنا چاہے امریکہ سے طلب کرلے۔ اسرائیل کے پاس اتنی دولت اور اتنی طاقت ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی بھی اسے پرواہ نہیں، تمام عرب ممالک اس کے جوتوں کی نوک پر ہیں۔عرب ملکوں کے پاس موجود تمام ہتھیار اور ان کے ہوائی اڈوں کی تفصیلات دستاویز کی شکل میں اسرائیل کے پاس موجود ہیں۔اس کے پاس وہ جوہری ہتھیار بھی ہیں جو کسی عرب ملک کے پاس نہیں ہیں۔

مسلمانوں کی عزت نیلام ہوچکی ہے اور اس کے سب سے زیادہ ذمہ دار وہ عرب ممالک ہیں جن کو اللہ نے پٹرول کی دولت سے نوازا تھا۔لیکن اس دولت سے انھوں نے صنعتی انقلاب لانے اور اسلحہ سازی کی طرف توجہ کرنے کے بجائے عیش وعشرت کی رنگینیوں میں ڈوبنا پسند کیا۔ انہوں نے پوری قوم کو صارفین کی قوم بنادیا۔حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ صرف ان ہی سامانوں کا استعمال کرتے جسے وہ خود بناتے۔کم ازکم ان کی صنعت اتنی ترقی یافتہ ہوتی کہ لوگ ان سے بھی سامان

درآمد کرتے، درآمد اور برآمد میں توازن قائم رہتا اور اسلحہ سازی کا تو حکم قرآن میں ہے "**واعدّوا لهم مااستطعتم**" اور قرآن نے یہ بھی بتادیا ہے کہ اسلحہ سازی کا معیار کیا ہونا چاہیے "**ترهبون به عدوّالله وعدوّکم**" یعنی معیار یہ ہونا چاہیے کہ دشمنوں پر تمہاری دھاک بیٹھ جائے۔ کیا کوئی مسلم ملک اس حکم خداوندی پر عمل کرسکا ہے؟

تمام عرب مسلم ملکوں میں استبدادی نظام جاری اور ساری ہے، اس وقت دین اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ ان ملکوں کے علماء اور دانشور اٹھیں اور حکومت سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ ملک کے اندر ایک انقلابی تبدیلی لائی جائے اور ایسا تعلیمی نظام رائج کیا جائے جس سے ایک طرف دین کو فروغ ہو، منکرات کے اڈے ختم کئے جائیں۔ دوسری طرف ملک کے اندر بڑے بڑے سائنٹسٹ اور ٹکنوکریٹ پیدا ہوں اور ملک میں صنعتی انقلاب آئے، اسلحہ سازی کے کارخانے قائم ہوں اور ہر اعتبار سے ملک کو خودکفیل بنایا جائے، حکومت کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری علماء اور مفکرین پر ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سب سے زیادہ ان ہی پر ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے ہزار گنا زیادہ طاقتور ہیں اور پھر وہ یہودی اور عیسائی جزیرۃ العرب کے اندر اور اس کے گردوپیش موجود ہیں، ان کی فوجی چھاؤنیاں ہیں، ان کی کمپنیاں ہیں، ان کے "این جی اوز" میں وہ وہاں برسرکار اور برسر ملازمت ہیں، وہ پورے طنطنہ اور رعب داب کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ وہ یہودی اور عیسائی ہیں جن کے بارے میں زبانِ رسالتؐ نے فرمایا تھا: "**اخرجوا الیهود والنصاریٰ من جزیرة العرب، لایبقی دینان فی جزیرة العرب**" یعنی جزیرۃ العرب سے یہود ونصاریٰ کو نکال باہر کرو، جزیرۃ العرب میں اسلام کے ساتھ کوئی دوسرا دین نہیں رہ سکتا ہے۔

جب یہود ونصاریٰ دنیا میں اتنے زیادہ طاقتور ہوں کہ وہ قوتِ عظمیٰ بن چکے ہوں اور جب نہایت خطرناک ہتھیاروں کا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہو اس وقت حرمین کی سرزمین کے گردوپیش ان کی موجودگی قیامت کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اِس وقت عالم اسلام کے قلب کی موت وحیات کا مسئلہ درپیش ہے، اس وقت ضرورت ہے کہ پورے عالم اسلام کو، اس خطرہ سے واقف کرایا جائے اور اہل علم کی جانب سے عرب حکمرانوں پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مستقبل کی صحیح منصوبہ بندی کریں۔ اس وقت جو حال ہے وہ بہت تشویشناک ہے، اس اضطراب انگیز صورت حال پر کچھ باغیرت اور باحمیت لوگوں کا دل کڑھتا ہے اور وہ قاشِ دل کو سامنے لاتے ہیں اور خونِ دل میں قلم کو ڈبو کر غم انگیز اور حمیت خیز تحریریں لکھتے ہیں تو یہ بات بھی سفارت کاروں کو ناگوار گزرتی ہے ۔

کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

☆☆☆☆

نقطۂ نظر

جامعات میں دینی تعلیم اور عصری تقاضے

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

جامعات میں دینی تعلیم اور اس کو درپیش داخلی اور خارجی مشکلات کے تناظر میں اہل نظر کا مدارس کے نصاب پر غور کرنا درحقیقت اس خیال کی عملی تعبیر تلاش کرنے کی سنجیدہ کوشش ہے کہ علم دین اپنے اندر ایک حرکی تصور رکھتا ہے۔ حالات و زمانے کی تبدیلی کے باوجود اپنی تازگی اور شگفتگی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ وہ تالاب کی طرح جامد اور بند نہیں بلکہ دریا کی طرح وسعت، حرکت اور تموج رکھتا ہے۔ دوسری تہذیبوں اور ان سے وابستہ علوم کے برخلاف اسلامی تعلیم صرف ماضی کا حوالہ نہیں بلکہ بہتر مستقبل کی جستجو اور آرزو ہے۔ وہ اپنے حاملین کو ماضی کا اسیر بنا کر نہیں رکھتا بلکہ امروز اور فردا کا نقیب بناتا ہے۔ اس کی یہ خوبی بے مثال ہے کہ وہ صرف جذبات و احساسات میں اعتدال اور پاکیزگی نہیں پیدا کرتا بلکہ مشاہدات و تجربات کی استقامت اور سلامتی سے بھی بحث کرتا ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے رہنما اصول فراہم کرتا ہے۔

یہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں ثبات اور لچک دونوں پہلو اعتدال کے ساتھ موجود ہیں۔ ثبات اس کے اصول وکلیات میں ہے اور لچک جزئیات اور فروعات میں۔ ثبات منصوص احکام میں ہے اور لچک مجتہد فیہ مسائل میں۔ ثبات سے امت کو قوت ملتی ہے اور لچک جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ چیلنج سے نبرد آزما ہونا سکھاتی ہے۔ دینی علم کے حاملین ہر دور میں ایسے علما اور ماہرین رہے ہیں جن کی علمی اور روحانی سرگرمیوں نے اسے تازگی اور زمانہ کو روشنی بخشی ہے اور وہ رسول کریم ﷺ کی اس پیشن گوئی کا مصداق ثابت ہوئے ہیں۔

انما یحمل هذا العلم من خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین، وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین (رواه البیهقی مرسلا) ''اس علم دین کے حامل میں ایسے لوگ ہوں گے جو انتہا پسندوں کی تحریف سے، باطل پرستوں کی فریب کاری سے اور جاہلوں کی تاویل سے اس کی حفاظت کریں گے یعنی علم دین پر ہونے والے داخلی اور خارجی حملوں کا دفاع کریں گے''،

ایک زمانہ تک دینی علم کے حاملین نے دنیا کی امامت کی ہے اور علم دین نے علم بالوحی یعنی قرآن وسنت اور فقہ واحسان

کے ساتھ علم بالسعی، یعنی منطق وفلسفہ، ہیئت وجغرافیہ، طب اور ریاضی کو اپنے دامن میں سمیٹ کر رکھا ہے، اس سے استفادہ کرنے والے صرف مسلمان نہ تھے بلکہ بڑی تعداد میں غیر مسلم بھی تھے جو بعد میں اپنے مذہب وسماج کی نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ ثابت ہوئے۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ یورپ کے پہلے دو میڈیکل کالج جو سالیرنو اور ماؤنٹ پیلیر میں قائم ہوئے ان کے نصاب میں علماء اسلام کی کتابیں شامل ہوگئیں۔ بالخصوص زکریا الرازی کی الحاوی، ابن سینا کی القانون اور ابوالقاسم الزہراوی کی التصریف کے لاطینی ترجمے صدیوں تک پڑھائے گئے۔

جب اسلام کی مرکزیت متاثر ہوئی اور مسلم دنیا شکست و ریخت سے دوچار ہوئی تو دینی علم کا دائرہ بھی سکڑتا چلا گیا۔ ریاضی، طب، ہیئت اور جغرافیہ دینی علم سے کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئے۔ علما کی امامت آفاق سے گھٹ کر مسجد تک محدود ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ تجرباتی علوم پر مغرب کی اجارہ داری ہوگئی۔ وہ جدید علوم میں شمار کیے جانے لگے اور تفسیر وحدیث، فقہ وتصوف اور تاریخ کی شناخت قدیم علوم کے طور پر رہ گئی اور یہ مدرسوں سے وابستہ ہوگئے۔ پھر دین ودنیا کی تعلیم میں وسیع خلیج حائل ہوگئی۔

اکیسویں صدی میں مغربی ذہن نے اسلامی ثقافت پر جو یلغار کی ہے اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اب مسلمانوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ دینی علوم کی تدریس پر بھی نظر ثانی کرو اور اپنا نظام بدلو کیوں کہ یہ علوم تعصب، تنگ نظری اور تشدد کی پرورش کرتے ہیں۔ آج کے حالات میں یہ مفید نہیں ہیں۔

سیاسی طاقت، ذرائع ابلاغ کی وسعت اور تہذیبی جارحیت نے اس مطالبہ کو مداخلت کی حد تک شدید کردیا ہے جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے مسلم حکمرانوں نے مغرب کا ایجنڈا قبول کرلیا ہے۔ بہت سے علما اور اسکالرس نے معذرت خواہانہ رویہ اپنا لیا ہے اور بہت سی جامعات نے اپنے نظام اور نصاب تعلیم پر نظر ثانی شروع کردی ہے۔ کچھ مسلمان دانشور دینی جامعات کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ ان کو بدلنا چاہیے۔ دینی جامعات میں وہ سب کچھ پڑھانا چاہیے جو کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ جو زیادہ باشعور ہیں وہ کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب کو چھوڑ کر مغربی علوم کو حاصل کرنے میں پہل کرنی چاہیے۔ اسلام نے تو مفید چیزوں کو اختیار کرنے اور غیر مفید چیزوں کو ترک کرنے کی خود ہی تعلیم دی ہے۔

اصولی طور پر بات درست ہے کہ اسلام دین اور دنیا دونوں کی جامعیت کا داعی ہے۔ اس لیے دینی جامعات میں دین و دنیا کی رہنمائی کا مناسب اور متوازن نظام ہونا چاہیے یعنی:

مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر
قدرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کی سحر کر

سوال یہ ہے کہ اگر دینی جامعات ان مشوروں کو قبول کرکے اپنے نظام کی اصلاح بھی کرلیں تو کیا مغرب دینی تعلیم کی مخالفت بند کردے گا اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی الزام تراشیاں اور سازشیں روک دے گا؟ شاید ایسا نہیں ہوگا بلکہ وہ مخالفت اور عناد کی نت نئی راہیں تلاش کرتا رہے گا۔ مغرب کو نہ تو مسلمانوں سے ہمدردی ہے، نہ ان کے علوم سے

دلچسپی ہے اور نہ ان کی ترقی اسے منظور ہے۔ اسے تو صرف اپنی تہذیبی توسیع پسندی اور سیاسی غلبہ سے دلچسپی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عراق و افغانستان کی تعلیم گاہیں برباد اور تجربہ گاہیں ویران نہ کی جاتیں۔ سجدہ گاہیں مسمار نہ ہوتیں اور اہل علم کا قتل عام نہ ہوتا۔ قرآن کریم نے صاف لفظوں میں کہا ہے:

ولن ترضى عنك اليهود ولا النصارى حتى تتبع ملتهم قل ان هدى الله هو الهدى (البقرہ: ۱۲۰) "یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے دکھایا ہے"۔

دینی علوم کے حاملین اور دینی جامعات کے ذمہ داروں کو اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھنے کے ساتھ مغرب کی شاطرانہ ذہنیت کو بھی سمجھنا چاہیے اور اپنی مؤمنانہ فراست سے کام لینا چاہیے۔ جس طرح آرٹس کالج میں انجینیرنگ کی اور لا کالج میں میڈیسین کی تعلیم نہیں دی جاتی، اسی طرح دینی جامعات میں ہر طرح کے علوم کی تدریس خلط مبحث سے کم نہیں۔ بلکہ مقصد سے دور کرنے کا باعث ہوگی۔ البتہ مفید علوم کی تدریس یا توسیعی خطبات کا اہتمام مفید ہوسکتا ہے یا تخصص کے شعبے کھولے جا سکتے ہیں ۲۰۰۹ء میں ہندوستان کے علماء و دانشوروں کی ایک جماعت کے ساتھ لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ برطانیہ کی وزارت خارجہ اور کامن ویلتھ کے آفس میں برطانوی افسران سے بین الاقوامی مسائل پر تبادلہ خیال ہوا۔ دوران گفتگو ایک آفیسر نے کہا کہ برصغیر کے دینی مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس سے شدت پسندی پیدا ہوتی ہے اور اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ راقم نے عرض کیا کہ مسلم علماء اور دانش ور بھی کچھ تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر یہ تبدیلی باہر سے تھوپی نہیں جاسکتی بلکہ مدارس کے اندر سے مفید علوم کو اختیار کرنے کی صدا بلند ہونی چاہیے۔ مدارس کی آزادی برقرار رکھتے ہوئے ہی نصاب میں تبدیلی مناسب ہے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ دینی جامعات کا نصاب و نظام تعلیم ہر دور اور ہر ذہن کے لیے نسخۂ کیمیا ہے۔ اس میں اصلاح اور ترقی کی گنجائش نہیں۔ زمانہ کی نبض شناسی کے لئے مفید اور ضروری علوم کی تدریس بھی ناگزیر ہے۔ دینی جامعات جس زمانہ اور جس ملک میں تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دیں اس زمانہ کی شعوری سطح اور انسانی ذہن کو سمجھنا، ان کی اصطلاح اور رجحانات سے واقف ہونا اور اس ملک کے مذہب، زبان، سماج اور تہذیبی روایت کو سمجھنا خود دین کے خادموں کے لیے لازم ہے۔ اس کے لیے دینی جامعات کو اپنا نظام متوازن اور مناسب بنانا چاہیے۔ دینی تعلیم کے بنیادی عناصر کو متاثر کیے بغیر اضافی مضامین کو کم کرکے مفید اور موثر مضامین کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جن میں انصاف، مساوات، آزادی، شورائیت اور رواداری جیسی عالمگیر اسلامی قدریں شامل ہوں۔ منطق اور فلسفۂ قدیم کی کتابوں میں کمی کی جاسکتی ہے اور ان کی جگہ فلسفۂ جدید اور نفسیات و معاشیات کی مبادیات شامل کی جا سکتی ہیں۔ کیوں کہ منطق کی ان تمام کتابوں کو پڑھ کر ہمارا نوجوان عہد وسطیٰ کی روحوں سے مناظرہ تو کرسکتا ہے مگر عہد جدید کے ذہن کو نہیں سمجھ سکتا اور نہ عصری مسائل سے آگاہ ہوسکتا ہے۔

مدارس کے نصاب میں منطق اور فلسفہ کی کتابیں اس لیے

شامل نصاب کی گئی تھیں کہ طلبا کا ذہن استدلالی بنے اور نتائج اخذ کر سکے۔ اس کے لیے ہمارے زمانہ میں بہتر مواد میسر ہے ہمیں اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خاں نے اپنے عہد کے دینی مدرسوں کے بارے میں لکھا تھا۔ جو علوم مسلمانوں میں مروج ہیں وہ بلاشبہ غیر مفید ہیں اور حسب احتیاجِ وقت نہیں ہیں اور یہی باعث ان کی مفلسی اور محتاجی کا ہے۔ کیوں کہ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں۔ اس لیے کہ ان سے نہ لوگوں کو کچھ فائدہ پہونچتا ہے اور نہ وہ خود کچھ اپنا بھلا کر سکتے ہیں۔ جو تعلیم حسب احتیاجِ وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ ایک عقلمند آدمی کا قول ہے اگر حسب احتیاجِ وقت لوگوں کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس اور محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں'' (مضامین تہذیب الاخلاق ۴۲۹/۲)

اکیسویں صدی تہذیبی مذاکرات، مفاہمت بین المذاہب اور عالمی اخلاقیات کی تفہیم کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ مگر دینی علوم کے حاملین ان میں مدلل، معقول اور موثر حصہ لینے سے قاصر ہیں۔ کیوں کہ معاصر ذہن و شعور کو اپیل کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔ اگر دینی جامعات مناظرہ کی جگہ تقابلی مذاہب کی طرف توجہ دیں تو اس کمی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ علمی ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے دلائل، علمی افق کی وسعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ادراک بھی ضروری ہے۔ ان تبدیلیوں کے پیچھے کارفرما عوامل اور محرکات کو سمجھنا بھی لازم ہے۔

اسی طرح علم کلام کی کتابیں اور ان کے مباحث عباسی عہد کی یادگار بن کر رہ گئی ہیں اور ان کو پڑھ کر طالب علم ماضی کا اسیر بن کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت اسلامی عقائد و احکام پر ملحدین اور مغربی ذہن کے جو اعتراضات و شبہات ہیں ان کا سامنا کرنے کے لیے جدید علم کلام مرتب کرنے کی ضرورت ہے تا کہ علماء آج کے اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب دے سکیں۔ شاید دینی جامعات نے اس پر غور و فکر کا سلسلہ ابھی تک شروع نہیں کیا ہے۔

مسلمانوں میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ چاروں فقہی مسالک اور ائمہ اربعہ برحق ہیں مگر تقابلی فقہ کی تدریس ہندوستانی جامعات میں نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ۔ دینی جامعات ایک فقہ کی کلیات و جزئیات کی تدریس پر اکتفا کرتی ہیں۔ اس سے فقہی جمود اور تقشّف پیدا ہوتا ہے اور مسلکی اعتدال کے بجائے مسلکی جدال کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک فقہ کے ساتھ دوسرے فقہ کے دلائل سے بھی تعرض کیا جائے نیز تقابلی فقہ کی تعلیم دی جائے تو وہ بیدار اور کشادہ ذہن تیار کیا جا سکتا ہے جس کی فی زمانہ اسلام کو ضرورت ہے۔

دینی جامعات میں تحقیق و تدوین کی روایت اور تنقیدی شعور کی کمی کا احساس عام طور پر کیا جاتا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ تبصرہ بہت سے لوگوں پر گراں گزرا تھا:

حلقہ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق

مگر حقیقی سرگرمیوں کی روایت دینی جامعات میں ابھی تک کمزور یا محدود ہے۔ اس کی وجہ سے جمود کا غبار ماحول پر چھایا

ہوا ہے اور صحت مند علمی فضا قائم نہیں ہو رہی ہے۔ تحقیق وتنقید کا شعور قدیم روایت سے انحراف نہیں ہے، بلکہ ماضی قریب میں تعلیم کے میدان میں جو غیر معمولی تجربے ہوئے ہیں ان سے استفادہ کی راہ آسان ہوتی ہے۔ ترقی کی جو روشن راہیں کھلی ہیں وہ طلبا کے ذہنی افق کو سرعت سے کشادہ کرنے کا باعث ہوئی ہیں۔ دینی جامعات کو جدید مناہج تدریس اور وسائل تعلیم سے آگاہ ہونا چاہیے اور ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔ نصابی کتابوں کی تیاری کے جدید اصولوں سے واقف ہونا چاہیے۔ صورت یہ ہے کہ ہزاروں دینی مدارس وجامعات میں مدرسین کی تربیت کا ایک ادارہ بھی قائم نہیں ہے۔ بعض مرکزی مدارس نے حال میں اس طرف توجہ دینی شروع کی ہے اور تدریب المعلمین کے وقتی پروگرام جاری کیے ہیں۔ اگر اردو زبان میں بی۔ ایڈ کا کورس چلایا جائے اور مدارس کا اس سے الحاق ہو تو یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔

دوسری طرف ان عصری یونیورسٹیوں کا رخ کیجئے جہاں اسلامیات اور دینیات کے شعبے قائم ہیں۔ وہاں تدریس وتحقیق کا کھلا ماحول ضرور ملتا ہے مگر دینی تعلیم کا دائرہ مختصر اور محدود ہے۔ اس کی حیثیت ضمیمہ جیسی ہے۔ پھر یہاں کی سرگرمیوں پر دینی خدمت سے زیادہ ملازمت کے تقاضے غالب ہیں۔ ان جامعات میں اسلامیات کے جو شعبے قائم ہیں وہ قرآن وسنت اور فقہ کی بنیادی تعلیم کے بجائے علوم کی تاریخ، مسلم افکار و تحریکات اور اسلام کے بارے میں مستشرقین کے افکار سے بحث کرتے ہیں۔ وہ اسلامی علوم میں مہارت پیدا کرنے کے بجائے اسلامی تمدن سے واقفیت پر زور دیتے ہیں۔

دینیات کے نام سے صرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک فیکلٹی ہے جہاں دینیات لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ تدریس کے ساتھ تحقیق بھی ہوتی ہے اور اس کے سربراہوں میں ملک کی مقتدر علمی شخصیات شامل رہی ہیں۔ مگر اس فیکلٹی کی حیثیت کا اندازہ لگانے کے لیے مشہور مستشرق ویلفیرڈ اسمتھ کا مشاہدہ سنیے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۱۹۵۹ء جب صدر شعبہ دینیات کا چارج سنبھالا تو پروفیسر اسمتھ نے ان کو لکھا:

''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا شعبۂ دینیات جس کسمپرسی کے عالم میں تھا اسے دیکھ کر سخت افسوس ہوتا تھا اور مسلمانوں کی بے حسی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا چنانچہ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ گیا اور یونیورسٹی میں ایک تقریر کرنے کا موقع ملا تو میں نے ذمہ داران یونیورسٹی کو اس طرف توجہ دلائی اور کہا کہ یورپ اور امریکہ میں اسلامی دینیات پر جو کام ہو رہا ہے اور وہاں اس مضمون کو اہمیت دی جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس یونیورسٹی میں جو مسلم یونیورسٹی کہلاتی ہے یہ مضمون اس قدر بے وقعت ہے''۔ (ماہنامہ برہان، دہلی۔ ستمبر ۱۹۶۳ء)

اس واقعہ کو پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے۔ مگر فیکلٹی دینیات میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں آئی جب کہ یہاں دینی علوم میں تحقیق کے علاوہ تقابلی مطالعہ مذاہب بننے کے امکانات موجود ہیں مگر ذہنی افلاس اور زوال تحقیق نے پیش قدمی کا راستہ روک رکھا ہے۔ دعا ہے کہ

مردے از غیب بروں آید وکارے بکند

☆☆☆

نقطۂ نظر

اردو شروحات کا بڑھتا رجحان اور طلبہ پر اسکے اثرات

محمد فرید حبیب ندوی

نصابی کتابوں کی تسہیل کے لئے مختلف مراحل میں مختلف کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔دقیق اور پیچیدہ کتابوں کی جگہ سہل اور آسان کتابوں کو نصاب میں شامل کرنا، فارسی اور عربی کتابوں کی جگہ اردو کتابوں کو نصاب میں جگہ دینا اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔انہی کوششوں میں ایک کوشش نصابی کتابوں کی شروحات و حواشی کا سلسلہ ہے۔

یہ شروحات وحواشی عربی زبان میں بھی رہے ہیں اور فارسی میں بھی،اور ان سے مرتب ہونے والے فوائد وثمرات کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا،مگر اب کچھ سالوں سے اردو شروحات کا ایک ایسا دریا بہہ پڑا ہے جو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

کسی حد تک نحو وصرف کی اردو شروحات کی بات تو سمجھ میں آسکتی ہے،مگر اسکا کیا کیا جائے کہ القراءۃ الراشدہ،مختارات اور معلم الإنشاء جیسی کتابوں کو بھی اردو قالب دے دیا گیا ہے۔

ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچئے کہ إنشاء کی کتابیں پڑھانے کا کیا مطلب ہے؟اسکا مطلب یہی تو ہے نہ کہ طالب علم عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمہ کی مشق بہم پہنچائے،اب جب شرح کی شکل میں پہلے ہی سے اسے ترجمہ تیار مل رہا ہے اور اب اسکا کام محض اپنی کاپی پر اسے نقل کرنا ہے تو کیا اس نقل سے اسے ترجمہ کی کچھ بھی مشق ہو سکے گی؟اور اس طرح کرنے سے اسے کیا خاک فائدہ حاصل ہوگا۔

اسی طرح ادبی کتابوں کی تدریس کا مقصد ہوتا ہے کہ طالب علم کے اندر ادبی ذوق پیدا ہو،عبارت فہمی کا ملکہ پروان چڑھے اور اسے ترجمہ کرنا آجائے۔مگر اب جبکہ اسے پہلے ہی سے شرح کی شکل میں اردو ترجمہ دستیاب ہے تو وہ مطالعہ کرنے کی زحمت کیوں گوارا کرے گا،الفاظ کے معانی دیکھنے کی مشقت کیوں برداشت کریگا،عبارت فہمی کی ضرورت ہی کیا سمجھے گا،اور جب وہ ایسا کرے گا تو پھر عبارت فہمی کا ملکہ اسمیں کیوں کر پیدا ہوگا،اور ترجمہ کرنا وہ

کیسے سیکھ پائے گا، آج کل طلبہ کی صلاحیت نہ بننے میں ان اردو شروحات کا بھی اثر ہے۔

وہ لوگ جو اس طرح کی کتابوں کی اردو شروحات لکھ کر طلبہ کی صلاحیت برباد کرنے پر تلے ہیں ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں کہ وہ اپنے ذرا سے مفاد کے لئے امت کے ان نونہالوں کی زندگی کیوں برباد کررہے ہیں، آخر معلم الإنشاء اور قصص النبیین کی اردو شرح لکھ کر وہ علم کی کونسی خدمت انجام دے رہے ہیں، اگر اس طرح وہ اپنے زعم میں طلبہ کے لئے سہولت فراہم کررہے ہیں تو اس سے بہتر ہے کہ انہیں ہدایہ اور بخاری اردو میں پڑھا دی جائے کہ اسمیں طلبہ کے لئے زیادہ سہولت ہے، اگر اردو کا ہی مولوی بنانا ہے تو پھر مشکل عربی کتابیں پڑھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس طرح کی اردو شروحات سے طلبہ کئی طرح کے نقصانات کا شکار ہوتے ہیں، ان میں سہولت پسندی، کاہلی اور سستی پیدا ہوتی ہے، مطالعہ کا جو تھوڑا بہت شوق ہوتا ہے وہ بھی ختم ہو جاتا ہے، تحقیق کا ذوق ماند پڑ جاتا ہے، خود سے کچھ سمجھنے کی صلاحیت صفر ہو جاتی ہے، اور اس طرح جب ان میں عربی سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں پیدا ہوتی تو وہ کچھ بھی کرنے سے خود کو معذور پاتے ہیں، اور اصل عربی مراجع سے استفادہ ان کے لئے ٹیڑھی کھیر سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ بعض معلمین کو دیکھا گیا کہ اردو شروحات دیکھ کر ہی پڑھاتے ہیں۔

آخر میں عرض ہے ان حضرات سے بھی جو اس طرح کی اردو شروحات تیار کرتے ہیں، اور ان حضرات سے بھی جو ان پر لمبی چوڑی تقریظیں اور تعریفی مقدمے تحریر کرتے ہیں، اور ان اداروں اور مطبعوں سے بھی جو انہیں فخریہ چھاپتے اور شائع کرتے ہیں کہ خدارا اپنے اس عمل پر نظر ثانی کریں۔ اور اگر ہو سکے تو ایسی کتابوں کو دریا برد کرنے کی تکلیف گوارا کریں۔ فإلی اللہ المشتکی وہو المستعان۔

☆☆☆

''جس طرح وہ بھیجا گیا، جن صفات و کمالات کے ساتھ بھیجا گیا، اسی شان، اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دمکتے ہوئے سورج کی مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے، ہر جگہ موجود ہے، ہر خطہ میں موجود ہے، اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح مشرق میں وہ آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔ یقیناً اس کی ضرورت جتنی چھٹی صدی کے باشندوں کو تھی اتنی ہی ضرورت اس وقت تک باقی ہے، پھر جب تک پیاس ہے پانی چھلکے گا اور جب تک بھوک ہے روٹی معدوم نہ ہوگی، آخر اس وقت تک کیا تھا جواب نہیں ہے۔'' (النبی الخاتم)

اسلامی تعلیمات

محاسبۂ نفس کیوں اور کیسے؟

محمد قمر الزماں ندوی

استاذ نورالاسلام کنڈہ، پرتاپگڑھ

محاسبۂ نفس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کئے ہوئے اعمال کا بھرپور اور سختی کے ساتھ حساب لے۔ یہ حساب اعمال کی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے لینا ضروری ہے۔ کمیت کے معنی یہ ہیں کہ اس پر کتنے کاموں کی ذمہ داری تھی اور اس نے کتنے کام انجام دیئے اور کیفیت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح ان کاموں کو انجام دینا چاہئے تھا اسی طرح انجام دیئے ہیں یا کوتاہیاں ہوئی ہیں، یہ جائزہ اور محاسبہ ایمان والوں کو روزانہ کرنا چاہئے قرآن مجید میں جگہ جگہ ایمان والوں کو محاسبہ نفس کا حکم دیا گیا ہے ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''یا ایھا الذین اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون''

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو ہر شخص کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کل (قیامت) کے لئے کیا بھیجتا ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ دیکھنا اور اس پر غور کرنا کہ انسان نے کل قیامت کے لئے کیا بھیجا ہے اور کیا بھیج رہا ہے محاسبۂ نفس ہے، اس آیت میں محاسبہ نفس کے ساتھ شروع میں بھی تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے اور آخر میں بھی تقوی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ جب تک انسان کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہوگا وہ محاسبۂ نفس کے لئے تیار اور آمادہ نہیں ہوسکتا اور اخیر آیت میں تقویٰ کا حکم دے کر اس طرف اشارہ ہے کہ محاسبہ اللہ سے ڈرتے ہوئے کرنا چاہئے ورنہ انسان کا نفس اتنا مکار اور عیار ہے کہ طرح طرح کے بہانے اور عذر لنگ تراش کر انسان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ احادیث میں بھی بے شمار جگہوں پر محاسبہ نفس کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے، اور عاجز وہ ہے جو اپنی خواہش نفس کے پیچھے چلے اور اللہ پر تمنا کرے۔ (ریاض الصالحین)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ عقل مند وہ ہے، جو چار وقت مقرر کرلے اور اس میں سے ایک وقت بیٹھ کر اپنے نفس کا محاسبہ کرے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''ازالۃ

الخفاء'' میں محاسبۂ نفس کے بارے میں حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ''اس سے پہلے کہ قیامت میں تمہارا حساب کیا جائے اپنے نفس سے محاسبہ کرو، اور اس سے پہلے کہ میزان حشر میں تمہارے اعمال تولے جائیں یہاں دنیا میں اپنے اعمال تولو، اور اللہ کے سامنے اس بڑی پیشی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو کہ جب تم خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی''۔ (ازالۃ الخفاء جلد۲ بحوالہ ماہنامہ زندگی)

محاسبۂ نفس سے مقصود یہ ہے کہ انسان جس طرح کاروبار میں اپنے خادم یا شریک کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے اس کیلئے کچھ اصول وضوابط طے کرتا ہے، پھر ان کی پابندی کرتا ہے، اور ہمیشہ اس پر نظر اور پھر آخر میں حساب کتاب کرتا ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ کیا نفع ہوا اور کیا نقصان، ٹھیک اسی طرح انسان کو اپنے نفس کا حساب لینا چاہیے کہ آج دن میں کتنی نیکیاں ہوئی اور کتنی برائیوں سے اجتناب کیا۔ امام غزالیؒ نے شریک تجارت سے حساب لینے کی مثال سامنے رکھ کر محاسبۂ نفس کی حقیقت اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے:

اللہ کے بندوں کو دن کے آخری کسی حصے میں اپنے ان اعمال اور حرکات وسکنات کا نفس سے حساب لینا چاہیے، جو دن بھر میں انہوں نے کئے ہیں، جس طرح دنیا کی تجارت میں تاجر لوگ اپنے شرکاء تجارت سے حساب لیتے ہیں خواہ وہ ہر سال کے اخیر میں حساب کرتے ہوں یا ہر ماہ یا ہر روز، وہ یہ حساب اس اندیشے سے لیتے ہیں کہ کہیں شرکاء تجارت انہیں نقصان نہ پہنچادیں۔ اور دوسرا محرک یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفع کا اندازہ ہوتا رہے، جب اس فانی اور عارضی دنیا کے نفع ونقصان کا حساب ضروری سمجھا جاتا ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ عاقل انسان اس حساب کتاب سے جان چرائے، جس کے نفع ونقصان سے اس کی ابدی سعادت یا بدبختی وابستہ ہے۔ کسی شریک تجارت سے محاسبہ کے معنی یہ ہیں کہ راس المال یعنی اصل پونجی اور پھر تجارت میں نفع ونقصان کا جائزہ لیا جائے اگر نفع ہوا تو شریک سے نفع وصول کیا جائے اور اس کا شکریہ ادا کیا جائے، اگر نقصان ہوا تو شریک کو تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا جائے اور آئندہ کے لئے تلافی مافات کا مطالبہ کیا جائے، اسی مثال کو سامنے رکھ کر سمجھو کہ دین میں بندۂ خدا کا راس المال فرائض ہیں اور نوافل وفضائل کی حیثیت نفع کی اور معصیت ونافرمانی کی حیثیت نقصان کی ہے۔ پورا دن اس تجارت کا زمانہ یا موسم ہے اور خود اس کا اپنا نفس اس کا وہ شریک ہے، جس سے حساب لینا ہے، سب سے پہلے فرائض کا حساب لینا چاہیے اگر تمام فرائض اس نے ٹھیک ٹھیک ادا کئے ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور نفس کو ترغیب دینی چاہیے کہ اس طرح وہ آئندہ بھی ادا کرتا رہے گا۔ اگر کوئی فرض چھوٹ گیا ہو تو اس سے قضا کا مطالبہ کرنا چاہیے اور اگر کسی فرض کو ناقص طور پر ادا کیا تو اس کو مکلّف بنانا چاہیے کہ نوافل سے اس کمی کو پورا کرے اور اگر اس سے کوئی معصیت ہوگئی ہو تو صرف ملامت پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کی تلافی پر اس کو مجبور کرنا چاہیے، جس طرح انسان نقصان کی صورت میں شریک کو تاوان ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور جس طرح تجارت میں پائی چھٹانک تک کا حساب کیا جاتا ہے اسی طرح یہاں بھی تمام جزئیات اور چھوٹی چھوٹی

باتوں کا حساب لینا چاہیے تا کہ نفس آئندہ کے لئے چوکنا رہے اور غفلت نہ کرے، اس حساب میں انسان کو میدان حشر کا نقشہ سامنے رکھنا چاہیے اور وہاں کے نفسی نفسی کا عالم روبرو ہونا چاہیے، دن بھر کے تمام اعمال، حرکات وسکنات، نشست و برخاست، سکوت اور گفتگو غرض جو کچھ بھی اس نے کیا سب کا حساب اور جائزہ ضروری ہے۔ (احیاء العلوم ج ۴ ص ۲۵۲)

ان تفصیلات کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ ہر شخص روزانہ یہ جائزہ لے کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں کس جگہ پر میں اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر رہا ہوں۔ اسلام پانچ قسم کے اعمال کا مجموعہ ہے: (۱) عقائد درست ہونے چاہئیں۔ (۲) عبادات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ درست ہونے چاہئیں۔ (۳) معاملات یعنی خرید وفروخت حلال طریقے سے ہو آمدنی حلا ل ہو، کوئی آمدنی حرام کمائی کی نہ ہو، (۴) معاشرت یعنی آپس میں رہنے سہنے کے آداب میں اللہ کے رسولؐ کے احکام کی اطاعت اور ان کی پابندی کرے۔ (۵) اخلاق یعنی انسان کے اخلاق درست ہوں برے اخلاق مثلاً بغض، تکبر، حسد، عناد وغیرہ انسان کے اندر نہ ہوں اور اچھے اخلاق سے آراستہ ہو، مثلاً تواضع ہو توکل ہو شکر اور صبر ہو۔ ان پانچوں شعبوں پر انسان عمل کرے تب انسان کا دین کامل ہوسکتا ہے۔ تب وہ شخص صحیح معنی میں مسلمان بنتا ہے۔ ہر شخص ان پانچ شعبوں کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لے مثلاً میرے عقائد درست ہیں یا نہیں میرے ذمہ پانچ وقت کی نماز با جماعت فرض ہے میں ان میں سے کتنی ادا کر لیتا ہوں اور کتنی نمازیں چھوڑتا ہوں میری آمدنی حلال ہو رہی ہے یا حرام ہو رہی ہے۔ بازار میں جب میں معاملہ کرتا ہوں تو وہ معاملات درست ہوتے ہیں یا درست نہیں ہوتے ہیں۔ میرے اخلاق اسلامی ہیں یا غیر اسلامی، دوسروں کے ساتھ میرا تعلق اور برتاؤ اچھا ہے یا برا۔ میں جھوٹ تو نہیں بولتا کسی کی غیبت تو نہیں کرتا۔ میری وجہ سے کسی کا دل تو نہیں دکھتا میں کسی کو پریشان تو نہیں کرتا۔ اپنے اندر ان باتوں کا جائزہ لے اور اگر کہیں کوئی کمی ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کرے اور دھیرے دھیرے کم کرنے کی کوشش کرے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں پر مالی اور بدنی کفارہ ادا کرے کیوں کہ بعض صحیح احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ دور نبوی میں صحابہ کرامؓ نے اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا کفارہ خود ادا کیا، یہ کفارہ مالی بھی ہوتا تھا اور بدنی بھی۔ مالی کفارہ کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ اپنا مال و اسباب صدقہ کر کے کوتاہیوں کی تلافی کی جائے، اور بدنی کفارے کا مطلب یہ ہے کہ تنبیہ کے لئے جسم کو حدود شرع کے اندر بطور تلافی کسی مزید بدنی عبارت وطاعت کا مکلّف بنایا جائے، اس لئے کہ انسان کے نفس کی مثال سرکش گھوڑے کی ہے۔ اس کے منہ میں جب تک خاردار لگام نہ ڈالی جائے وہ بمشکل سیدھا ہوتا ہے۔ ذیل میں صحابہ کرام کی زندگی کے چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں جن میں اس طرح کے کفاروں کا ذکر ملتا ہے۔

(۱) حضرت ابوطلحہ انصاریؓ ایک دن اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتنے میں ایک پرندہ اڑا اور باغ سے نکلنے کی جگہ تلاش کرنے لگا، باغ اتنا گھنا تھا کہ اسے نکلنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ ابوطلحہؓ کو یہ منظر بہت اچھا لگا اور وہ تھوڑی دیر تک پرندے کو ادھر ادھر پرواز کرتے دیکھتے رہے۔ پھر جب

اپنی نماز کی طرف متوجہ ہوئے تو یہ بھول چکے تھے کہ انہوں نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔اب انہیں احساس ہوا کہ وہ اپنے باغ کی وجہ سے ایک فتنے میں مبتلا ہو گئے۔نماز سے فارغ ہو کر وہ حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ کہہ سنایا، اس کے بعد کہا یا رسول اللہ! وہ باغ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے آپ جہاں چاہیں اسے صرف (خرچ) فرمائیں۔

(۲) قبیلہ انصار کے دوسرے شخص کا واقعہ مؤطا امام مالک میں ہے کہ کھجور کے درختوں میں پھل آنے کا زمانہ تھا اور مدینے کی وادیوں میں ایک وادی قف ہے اس میں قبیلہ انصار کے ایک شخص کا باغ تھا۔ایک دن وہ اس باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کی نظر کھجور کے درختوں پر پڑی۔درخت خوشوں سے لدے ہوئے تھے اور ایسا نظر آ رہا تھا کہ انہیں پھلوں کے طوق پہنائے گئے ہیں۔اس منظر سے ان کا دل بہت خوش ہوا، اب نماز کی طرف متوجہ ہوئے تو رکعتیں بھول چکے تھے۔انہوں نے دل میں کہا کہ میرے اس مال نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا، وہ حضرت عثمانؓ بن عفان کے پاس گئے جو اس زمانہ کے خلیفہ تھے، آپ کو واقعہ سنایا اور کہا، وہ باغ خدا کی راہ میں صدقہ ہے۔ آپ اسے خیر و اصلاح کے کاموں میں صرف فرمائیں حضرت عثمانؓ نے اس کو پچاس ہزار میں فروخت کیا، اس کے اس باغ کا نام ہی خمسین الف (پچاس ہزار) پڑ گیا۔

(۴) ایک بار حضرت عمرؓ کی نماز عصر کی جماعت فوت ہوگئی، اس کے کفارے میں انہوں نے اپنی ایک قیمتی زمین صدقہ کر دی۔حضرت عمرؓ کا حال یہ تھا کہ جب رات ہوتی تو اپنے قدم کو درے پر رکھتے اور اپنے نفس سے کہتے کہ آج تو نے کیا کیا ہے۔

(۵) اگر کبھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی نماز عشاء کی جماعت چھوٹ جاتی تو وہ رات بھر عبادت کرتے۔

(۶) ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ اتنی دیر سے نماز مغرب ادا کر سکے کہ ستارے نکل آئے تھے اس کے کفارے میں انہوں نے دو غلام آزاد کیے۔

حضرت تمیم داری کے بارے میں آتا ہے کہ ایک بار ان کی تہجد کی نماز قضا ہوگئی تو وہ سال بھر تک زیادہ جاگ کر اس کی تلافی کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو محاسبۂ نفس کی توفیق عطا فرمائے، آج پوری دنیا میں جو فساد پھیلا ہوا ہے اور ایمان سوز، اخلاق سوز اور حیا سوز فتنے جو اٹھ رہے ہیں اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہم میں کوئی بھی اپنے دامن کو نہیں، دیکھتا، ایک لمحہ بھی اپنے گریبان مین جھانکنے کے لئے تیار نہیں ہم میں سے ہر شخص کی نظر دوسروں کی برائی اور خرابی پر رہتی ہے۔ جبکہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم خود اپنے آپ کی اصلاح کریں، آج اگر دنیا میں اس پر عمل ہو جائے کہ ہر شخص پہلے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر نظر رکھنا شروع کر دے اور کوتاہیوں اور خامیوں سے بچنا شروع کر دے تو پھر اس دنیا میں امن و سکون کا ماحول بننے لگے اور امیر و غریب، ظالم و مظلوم، چھوٹے بڑے، طاقتور کمزور، گورے کالے سب کے مسئلے حل ہو جائیں گے۔بس شرط ہے کہ انسان اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے اور خدائی اصول وضوابط پر عمل کرنا شروع کر دے۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

صفر المظفر: قرآن وسنت کی روشنی میں

مولانا ندیم احمد انصاری (ایم اے، جرنلزم)
(ڈائریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن انڈیا و مہتمم مدرسہ نور محمدی)

اسلامی سال کا دوسرا مہینہ ''صفر المظفر'' ہے۔اس مہینہ سے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی خصوصی فضیلت وارد ہوئی ہے نہ نحوست۔

''صفر'' کی وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینے میں عموماً عربوں کے گھر خالی رہتے تھے، کیوں کہ وہ ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم الحرام کے مہینوں میں---ان کے حرمت والا ہونے کی وجہ سے جنگ و جدال بند رکھتے تھے اور یہ تینوں مہینے مسلسل ہوتے ہیں،اس لیے ان کے گزرتے ہی عرب اپنی موقوف جنگوں کو ازسرِنو شروع کر دیتے تھے اور سفر پر چلے جاتے تھے،جس سے مکان خالی ہو جاتے تھے۔اس پر عرب کہتے ''صفر المکان''۔صفر کی جمع ''اصفار'' ہے۔(انظر:تفسیر ابن کثیر:7/195)

''صفر'' کے مفہوم کی وضاحت کرنے کے لیے مختلف اقوال وارد ہوئے ہیں،جن کا خلاصہ تین باتیں ہیں:

(۱)اول یہ کہ اس سے مراد مشہور ماہِ صفر ہے۔

(۲)دوم یہ کہ اس سے مراد پیٹ کے کیڑے ہیں۔

(۳)سوم یہ کہ اس سے مراد "نسی" ہے یعنی اشہرِ حرم میں سے کسی مہینہ کی عظمت کو طول دے کر اس میں دوسرا مہینہ شریک کر لینا۔(ماثبت بالسنۃ:18،وانظر:لطائف المعارف:148)

زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے بہت سی غلط اور بے بنیاد باتیں اس مہینے سے منسوب کر رکھی تھیں اور وہ مختلف وجوہ سے اس مہینے کو منحوس سمجھتے تھے، وہ پیٹ کے کیڑے کو صفر کہتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ ہے جو بھوک کے وقت ڈستا ہے، اسلام نے ان سب باتوں کو باطل قرار دیا۔(بذل المجہود:16/242-243) چوں کہ ان کے ہاں اس مہینے سے متعلق بہت سی بے سروپا باتیں منسوب تھیں،اس لیے وہ ان بدفالیوں سے بچنے کے لیے اس ماہ کی تقدیم وتاخیر کے مرتکب تھے۔

اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُحِلُّوۡنَہٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوۡنَہٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوۡا عِدَّۃَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ فَیُحِلُّوۡا مَا حَرَّمَ اللّٰہُ، زُیِّنَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ اَعۡمَالِہِمۡ، وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ

الْكٰفِرِين﴾۔(التوبۃ:37)

ادب کے کسی مہینے کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں بڑھ جانا ہے،اس سے کافر گمراہی میں پڑے رہتے ہیں۔ایک سال تو اس کو حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال حرام،تاکہ ادب کے مہینوں کی؛ جو اللہ نے مقرّر رکھے ہیں،گنتی پوری کر لیں اور جو اللہ نے منع کیا ہے،اس کو جائز کر لیں۔ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں اور اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

بعض لوگوں کے نزدیک صفر سے مراد نسی ہے،یعنی ماہِ محرم کے ایام کو بڑھا کر صفر کا مہینہ اس میں شامل کر لینا اور ماہِ صفر کو ماہِ محرم ٹھہرا کر اسے ایک معزز مہینہ بنالینا۔(ماثبت بالسنۃ:18)

زمانۂ جاہلیت کے اس عمل کی تردید کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بلاشبہ زمانہ اپنی اسی اصل حالت پر لوٹ آ گیا ہے،جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان و زمین کی تخلیق سے پہلے مقدر فرمایا تھا۔سال؛ بارہ مہینے کا ہوتا ہے،ان میں سے چار مہینے احترام وادب والے ہیں۔تین مہینے مسلسل؛ ذی القعدہ،ذی الحجہ،محرم الحرام اور ایک مہینہ مضر کا رجب ہے،جو جمادی الآخر اور شعبان کے درمیان ہے۔(مسند احمد: 20347، البخاری: 67، مسلم: 1679، ابوداود: 1947، الترمذی:1520،النسائی:4130،ابن ماجہ:233)

اس حدیث میں ماہِ رجب کی نسبت قبیلۂ مضَر کی طرف اس لیے کی گئی کہ یہ قبیلہ دیگر قبائل کے بالمقابل اس ماہ کی حرمت کے سلسلے میں زیادہ متشدد تھا۔

ماہِ صفر کی حیثیت: اسلام میں

اسلام سے قبل لوگ اس ماہ کو منحوس سمجھتے تھے،لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس توہم کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا:صفر کے مہینے میں نحوست کی کوئی حقیقت نہیں۔(بخاری:5757،5707، مسلم: 2220،ابوداود: 3912)اس حدیث میں صراحتاً رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمادیا کہ مرض کی تعدی کوئی چیز ہے نہ بدفالی،الّو کے بولنے سے کوئی نحوست آتی ہے اور نہ ماہِ صفر میں نحوست ہے۔

ایک بے اصل روایت اور اس کا حکم

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں؛ بعض کتبِ تصوف میں ایک حدیث لکھ دی ہے:

﴿من بشرنی بخروج صفر،بشرته بالجنة﴾

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھے ماہِ صفر کے گزرنے کی بشارت دے گا،میں اس کو جنت کی بشارت دوں گا۔

اس روایت سے بعض لوگوں نے اس ماہ کی نحوست پر استدلال کیا ہے،مگر یہ دلیل ثبوتاً ودلالتاً دونوں طرح مخدوش ہے۔علامہ ابن جوزی علیہ الرحمہ نے اس روایت کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔(کتاب الموضوعات:2/348 ندیم)یعنی نہ تو یہ حدیث ثابت ہے اور نہ یہ اس مضمون پر دال ہے۔اگر یہ روایت صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس کا اصل مفہوم یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی وفات چوں کہ ماہِ ربیع الاول میں ہونے والی تھی اور آپ ﷺ انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ کے دیدار وملاقات کے مشتاق تھے،اس لیے ربیع الاول کے شروع ہونے اور صفر کے پورا ہونے کی خبر کا آپ ﷺ کو انتظار تھا۔پس اس خبر کے لانے

پر آپ ﷺ نے بشارت کو مرتب فرمایا۔ چناں چہ کتبِ تصوف میں اسی مقصد کے اثبات وتائید کے لیے اس کو وارد کیا ہے۔ بہر حال! نہ یہ دلیل ثابت ہے اور نہ اس کی دلالت ثابت، پس دعویٰ نحوست باقی اور درست نہ رہا۔ (زوال السنۃ:8-9، بتغیر)

معلوم ہوا کہ ماہِ صفر میں نہ کوئی خصوصی فضیلت وارد ہوئی ہے نہ نحوست۔ مسلمان کا بڑا کام اور سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کا اتباع کریں اور اتباع کرنے میں اس کو اچھی طرح علماء سے تحقیق کریں کہ یہ قول وفعل حضور ﷺ سے ثابت ہے یا نہیں، سنی سنائی بے سند باتوں کی اتباع کرنا گناہ ہے۔ (اغلاط العوام:38 بتغیر)

تیرہ صفر کو سفر نہ کرنا / ماہِ صفر میں نکاح وغیرہ نہ کرنا: بعض لوگ ۱۳ر صفر کو گھر سے باہر جانا یا سفر کرنا-- ممنوع سمجھتے ہیں، لیکن قرآنِ وحدیث اور فقہ-- کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ۱۳ر صفر کو سفر کرنا جائز نہیں۔ (خیر الفتاویٰ:1/80، جامع الفتاویٰ:1/344)

مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری علیہ الرحمہ نے خوب لکھا ہے:

واقع میں دن، مہینہ یا تاریخ منحوس نہیں ہوتے۔ نحوست تو بندوں کے اعمال وافعال پر منحصر ہے۔ ماہِ صفر اور اس کے ابتدائی تیرہ دنوں کو منحوس سمجھ کر شادی، منگنی اور سفر وغیرہ جیسے کاموں سے رک جانا سخت گناہ ہے۔ 'نصاب الاحتساب' میں ہے کہ کوئی شخص سفر کے ارادہ سے گھر سے نکلے اور کوے کی آواز سن کر سفر سے رک جائے تو بزرگوں کے نزدیک وہ شخص کافر شمار ہوتا ہے۔ (مجالس الابرار:248) مشرکین ماہِ صفر کو تیرہ تاریخوں تک منحوس سمجھتے تھے اس لیے آنحضرت ﷺ نے (اس نحوست) کی تردید فرمائی۔ افسوس! مسلمان اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے فرمان کے خلاف مشرکین کے عقیدہ کی اقتداء کر رہے ہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ جدید:2/22 ملخصاً، ترتیبِ پالنپوری)

ماہِ صفر کا آخری بدھ

بعض لوگ ماہِ صفر کے آخری بدھ کو خوشی کی تقریب مناتے ہیں اور مٹھائی وغیرہ تقسیم کرتے ہیں، جب کہ یہ سب بلا دلیل ہے۔ لوگوں میں اصلاً یہ غلط بات مشہور ہوگئی کہ اس دن حضرت نبی کریم ﷺ نے غسلِ صحت فرمایا تھا اور آپ کے مرض میں افاقہ ہوا تھا۔ جب کہ یہ درست نہیں، البتہ شدتِ مرض کی روایت وارد ہوئی ہے۔ (انظر: مدارج النبوۃ:2/707، سیرۃ المصطفیٰ:3/157، الرحیق المختوم:727)

ہاں لیکن چوں کہ مسلمان رسول اللہ ﷺ کے مرض میں شدت ہونے کی یہ خوشی نہیں مناتے اور نہ یہودیوں کی موافقت میں ایسا کیا جاتا ہے، پھر یہ امر فی نفسہٖ بھی کفر وشرک نہیں ہے، اس لیے ان حالات میں اس عمل پر کفر وشرک کا حکم نہیں لگایا جائے گا، لیکن یہ ایک نامناسب طریقہ ہے، اس لیے اس سے بچنا چاہئے۔ یہ بھی خیال رہے کہ غیروں کی مشابہت دانستاً کی جائے یا نادانستہ طور پر ہو جائے، بچنا اس سے بھی چاہئے۔

اب شاید کسی کو یہ خیال آئے کہ چوں کہ اس ماہ میں خلاصۂ کائنات کا مرض شدت اختیار کر گیا تھا، اس لیے یہ مہینہ نامبارک ہے۔ یہ خیال بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ اس مہینہ میں آپ ﷺ کا مرض بڑھا تھا نہ کہ اس مہینہ کی وجہ سے، دونوں میں واضح فرق ہے۔ پھر یہ بھی تو سوچئے کہ اس ماہ

میں یہ واقعہ نہ ہوتا تو کسی اور مہینہ میں ہوتا، اور اگر آپ ﷺ کے اس مہینہ میں بیمار ہونے یا بیماری میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے اس مہینے کو نامبارک سمجھتے ہیں تو ربیع الاول کو اس سے زیادہ منحوس سمجھنا چاہئے۔ جب کہ ایسا کوئی نہیں سمجھتا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب واہیات ہیں، شریعت میں ان باتوں کی کوئی اصل نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ جدید: 3/278-280)

ماہِ صفر کا روزہ:

بعض لوگ ماہِ صفر کے آخری بدھ کو خصوصیت سے روزہ رکھتے ہیں، جب کہ اسلام میں اس کی کوئی مشروعیت نہیں۔ 'امداد المفتیین' سے ایک سوال جواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال: ماہِ صفر کا آخری چہار شنبہ، بلادِ ہند میں اس طور پر مشہور ہے کہ اس دن خصوصیت سے نفلی روزہ رکھا جاتا ہے اور شام کو کچوری یا حلوا پکا کر کھایا جاتا ہے۔ اس روزہ کو کچوری روزہ یا پیر کا روزہ کہتے ہیں۔ شرعاً اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟

جواب: بالکل غلط اور بے اصل ہے۔ اس کو خاص طور پر رکھنا اور اس پر خاص ثواب کا عقیدہ رکھنا بدعت اور ناجائز ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ اور تمام صحابہ کرامؓ سے، کسی ایک ضعیف حدیث میں بھی اس کا ثبوت بالالتزام مروی نہیں اور یہی دلیل ہے اس کے بطلان و فساد اور بدعت ہونے کی، کیوں کہ کوئی عبادت ایسی نہیں، جو حضرت نبی کریم ﷺ نے امت کو تعلیم کرنے اور سکھانے سے بخل کیا ہو۔ (امداد المفتیین: 416 بتصرف)

ماہ صفر کے آخری بدھ میں عمدہ کھانا پکانا

بعض لوگ کہتے ہیں؛ چوں کہ حضرت نبی کریم ﷺ کو ماہِ صفر کے آخری بدھ میں مرض سے شفا ہوئی تھی، اس لیے اس دن عمدہ کھانا وغیرہ پکانا چاہیے۔ اس واقعہ سے اس طرح کا کوئی مسئلہ نکالنا اور اپنے طور پر اس دن کو ہر سال خوشی اور مسرت کا باعث سمجھنا غلط اور من گھڑت عقیدہ ہے، اس لیے ناجائز اور گناہ ہے۔ (مستفاد من أحسن الفتاویٰ: 1/360)

بلا اعتقاد اگر نحوست کا خیال آجائے

؟ جو بات مشہور ہوتی ہے، وقت پر اس کا خیال آ ہی جاتا ہے، لیکن اس خیال پر عمل کرنا یا اس کو دل میں جمائے رکھنا، یہ جائز نہیں، بلکہ توکل کو غالب کرے تو باطل خیال فوراً رفع دفع ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ (الفضائل والاحکام للشہور والایام: 18)

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں اس طرح کی کوئی بات نہ آتی ہو، مگر اللہ پر توکل سے یہ دور ہوجاتی ہے۔'' (ابو داود: 3910، ترمذی: 1624، ابن ماجہ: 3538) حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بدفالی سے ڈر محسوس کرتا ہو یا اس سے (اس کے گمان کے مطابق) کچھ نقصان پہنچتا ہو، اس کے متعلق اس طرح دعا کرے: اَللّٰھُمَّ لَا طِیْرَ اِلَّا طِیْرُکَ، وَلَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُکَ، وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ.

اے اللہ! آپ کے شگون کے سوا کوئی شگون نہیں اور آپ کی خیر کے سوا کوئی خیر نہیں، اور آپ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ (فتح الباری: 10/224)

☆☆☆

تربیت اولاد

(قسط-۳)

شخصیت کی تعمیر وتشکیل

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

عمر کے پہلے ۵ سالوں میں بچے کی شخصیت میں جو چیزیں جڑ پکڑ جاتی ہیں ان میں اعتماد بھی ہے، اعتماد اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے ان میں پیدا ہوتا ہے، خواہ دوسروں پر اعتماد کرنا ہو یا اپنے اردگرد کی دنیا پر یقین کرنا ہو، دوسری چیز جو اس عمر میں بچے کے اندر پیدا ہوتی ہے وہ اپنی ذات کا عرفان ہے، پھر ۵ سے ۱۱ سال تک کی عمر میں جو چیزیں اس کے مزاج وشخصیت کا حصہ بنتی ہیں اس میں ذاتی اقدامات، قدرت ولیاقت اور خود اعتمادی (Self Confedance) سرفہرست ہے، عمر کے اس مرحلہ میں بچہ میں شدت سے ان چار چیزوں کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

اقدام: اگر بچہ کی تربیت اس طرح کی جائے کہ اس کو اس کا مکلّف بنا دیا جائے کہ وہ جس کام میں بھی جب بھی ہاتھ لگائے ضروری ہے کہ پہلی ہی کوشش اور پہلے ہی مرحلہ میں کامیاب ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خوف وتردد کی کیفیت سے دوچار ہوجائے گا، پھر کسی کام کی ذمہ داری لینے سے وہ یوں خوف کھائے گا کہ اس کو اپنی قوت کمزور نظر آنے لگے گی اور ہر کام پر اقدام کرنے سے پہلے ہی اسے خطا اور ناکامی کا احساس ستانے لگے گا، حالانکہ انسانی زندگی میں ہر آنے والے لمحہ میں اقدام کی کیا اہمیت ہے وہ ہم پر مخفی نہیں، ہم اگر یہ چاہیں کہ محض گفتگو کے ذریعہ اقدام کی اہمیت بچہ پر واضح کردیں تو یہ کافی نہیں بلکہ اس سے خاطر خواہ فائدہ بھی نہ ہوگا، بلکہ ایسے مواقع فراہم کرنے ہوں گے جس میں عملی طور پر اقدام کی اہمیت اجاگر کی جائے، اس کا آسان طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ والدین جب کسی کام کو انجام دینا چاہیں تو نہ صرف بچہ کو اس میں شریک کرلیں بلکہ اس کو اس حد تک چھوٹ دیں کہ وہ ذمہ داری قبول کرکے اس کام میں قائدانہ کردار ادا کرے اور بطور مربی والد یا والدہ کی شرکت محض ایک معاون کی سی ہو۔

جب آپ کے دوست یا مہمان وغیرہ آئیں تو بجائے اس کے کہ آپ بچہ کا تعارف کرائیں اسے چھوٹ دیں کہ اپنے متعلق وہ خود ان سے گفتگو کرے، اس موقع پر اس سے بھی احتراز کرنا ہوگا کہ آپ بچہ کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ آپ کے متعلقین سے وہی بات کہے جو آپ کی مرضی کے مطابق ہو اور

جو آپ بتانا چاہتے ہوں، اسی طرح اس کے پاس اگر جیب خرچ وغیرہ ہو تو اسے مکمل اختیار دیں کہ اس میں خود تصرف کرے اور خود اپنی پسندیدہ اشیاء خریدے البتہ آپ اسے نہایت حکیمانہ انداز میں پیسہ کے استعمال کی ہدایات دیں، اسی طرح آزادی دیں کہ وہ خود اپنے کمرے کی ترتیب (Setting) اور نظم کو دیکھے، اسی طرح اس کو گھر اور فیملی کے مختلف مسائل میں اپنی رائے دینے کی مکمل آزادی دینی چاہیے۔

بچہ کی خصوصیات کی قدر کرنی چاہیے : بچہ میں جیسے جیسے اقدام کی یہ صلاحیت پیدا ہوتی جائے ضروری ہے کہ اس کی خصوصیات اور اس کی خاص ذاتی زندگی کے لئے اس کو مواقع دیے جائیں، خاص نجی زندگی کا تصور بچے میں عام طور پر عمر کے چھٹے سال میں وجود پذیر ہونا شروع ہوتا ہے، اس مرحلہ میں یہ بات تقریباً لازمی ہوتی ہے کہ بچہ میں کچھ خاص عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں، کبھی اس کو کچھ وقت تفکیر و راحت کے لئے تنہائی کی عادت پڑ جاتی ہے، دوسروں سے ملنے جلنے کے لئے وہ وقت کی تحدید کر لیتا ہے، یہاں تک دیکھا جاتا ہے کہ ایک بچے کے کمرے میں اگر اس کے دوسرے بھائی بہن سوئیں تو وہ بچہ اپنے لیے ایک کونے کنارے کو منتخب کر لیتا ہے، جب اس کو آرام کرنے یا سکون کے لمحات گزارنے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اسی گوشہ کو اپنے لیے خاص جگہ اور گوشۂ عافیت تصور کرتا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے ہو جاتا ہے کہ جو لوگ بھی اس کمرے میں بچے کے ساتھ سوئیں وہ تقسیم و ترتیب کا خاص لحاظ رکھیں، اس سلسلہ میں آپ ان بچوں کی اس طرح مدد کر سکتے ہیں کہ ان کے لئے بعض قواعد و ضوابط متعین کر کے ان کو اس کمرے میں مشترک زندگی کا سلیقہ سکھائیں جو ان میں باہمی تفاہم و ارتباط اور گھلنے ملنے کی صلاحیت کو زیادہ مناسب طریقہ پر پیدا کر سکتا ہے، اس طرح کے قواعد وضع کرنے کی ضرورت عام طور سے جن مسائل میں پیش آتی ہے اس میں لائٹ بند کرنا، کب جلانا ہے، شور و غوغا، ریڈیو، ٹی، وی وغیرہ کی آواز اور کمرے میں کھانے وغیرہ کے مسائل ہیں، لیکن مسائل میں اگر تھوڑی سی محنت اور باہمی تفاہم کی عادت ڈال دی جائے تو مستقبل میں یہ عادت بڑی کارآمد ہوتی ہے، عام طور پر بچے ایک دوسرے پر غصہ کرنے بلکہ چڑھانے اور چھیڑنے کے لئے اس طرح کے قواعد کی پابندی نہیں کرتے، پھر یہاں تربیتی مرحلہ آجاتا ہے کہ مناسب و مفید طریقہ سے ان کو تنبیہ کی جائے اور قواعد و ضوابط کی پابندی کا عادی بنایا جائے، ویسے صحیح بات یہ ہے کہ اصولی زندگی میں مشکلات ان لوگوں کی زندگی کے بالمقابل بہت کم آتی ہیں جن کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ ''جس کا جو من چاہے وہ کرے''۔

بچہ کا کمرہ صرف اس کے لیے خاص ہو یا مشترک ہو مگر یہ ضروری ہے کہ اس کو بعض شخصی خصوصیات کا مالک بنانے کے لئے اس کی نفسیاتی ضرورت اور ذاتی خصوصیات کا احترام کیا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ معقول حدود میں رہتے ہوئے اس کے قول اور اس کی رائے پر عمل درآمد ہو، اس کو صاحب نظریہ اور صاحب رائے بنانے کیلئے یہ عمل انتہائی ضروری ہے، مثلاً معقول حدود میں رہتے ہوئے اس کو آزادی دی جائے اور اس کی خواہش کا احترام کیا جائے کہ اس کو کمرے میں کون سا رنگ پسند ہے، دیواروں پر کیسی سینریز وہ لگانا چاہتا ہے،

پردے اس کو کس رنگ کے پسند ہیں، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بچہ اپنی اختیاری اشیاء کے ساتھ زندگی گزارنا سیکھے گا اور ان کی قباحتوں و منافع کا از خود اس پر انکشاف ہوگا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ بچہ پر جتنی جلدی اس کا انکشاف ہو اور نئی خواہش کا مطالبہ کردے تو اسے فوراً پورا کیا جائے، اس کو اس طرح یہ شعور بھی پیدا ہوگا کہ ایک رائے کو اختیار کرنے کے بعد اس پر استقرار ہونا چاہیے اور یہ بات بھی سمجھ میں آئے گی کہ اپنی رائے پر عمل کرنے سے قبل سوچنا، پلان کرنا اور دوسروں سے مشورہ کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ بات فطری طور پر متوقع ہے کہ جب آپ بچے کو اقدامات کرنے کی چھوٹ دیں گے تو بسا اوقات بعض مشکلات پیش آئیں گی، آپ کے اور اس کے درمیان نظریات کا فرق ہوگا، بسا اوقات آپ کو بچے کے انتخاب کو کالعدم قرار دینا پڑے گا اور مداخلت کرنی پڑے گی، لیکن ایسے موقع پر آپ کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ آپ بچے کو یہ باور کرائیں کہ آپ اس کی رائے اور نقطۂ نظر کی قدر کرتے ہیں اور ساتھ ہی بہت مناسب انداز میں یہ وضاحت کرنی پڑے گی کہ آپ اسکے انتخاب کو کیو ں غیر علمی اور غیر مناسب قرار دے رہے ہیں اور آپ کو اس کے اقدام و عمل میں کیوں مداخلت کے لئے مجبور ہونا پڑا، ایسے موقع پر بہت سادہ انداز کے جملوں سے اس کو سمجھایا جاسکتا ہے مثلاً اس سے کہا جائے ''بیٹے تمہارا انتخاب درست ہے لیکن دیکھو یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تجربہ آئندہ کسی موقع پر کریں، اس وقت بعض وجوہات کے سبب اس دوسری رائے پر عمل کریں'' یا یوں کہیں کہ ''میں اچھی طرح تمہارا نقطۂ نظر سمجھ گیا بیٹا، لیکن بیٹا ذرا میرے ساتھ تم یہ سوچنے کی کوشش کرو کہ اگر ایسا کرلیا گیا تو ایسا ایسا ہوگا.....'' اس طرح کی نرم و مناسب گفتگو کے دو فائدے ہوں گے، ایک تو یہ کہ بچہ آسانی سے سمجھ جائے گا اور آپ کی بات کا قائل ہوجائے گا، دوسرا یہ کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ کس طرح آپ کی رائے پر بحسن وخوبی اقدام کرتا ہے۔

اس مرحلہ میں والدین کے لئے یہ بات ضروری ہوجاتی ہے کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر بچے کے اقدامات پر اپنا ردعمل ظاہر کریں، بعض مواقع پر بچے اس طرح کے اقدامات کر گزرتے ہیں جس سے لازمی طور پر آپ کو غصہ آتا ہے، مثلاً عید کے دن آپ کا کوئی دوست آئے اور آپ کا بچہ اس کو عیدی دینے لگے، آپ اس پر غصہ ہوکر اسے ڈانٹ دیں، یا یہ کہیں کہ ان کو اس کی ضرورت نہیں تو اس طرح کے ردعمل سے بچہ میں اقدام کی صلاحیت میں کمی آئے گی اور کم از کم آپ کے اس دوست سے ملاقات کرنے سے وہ ضرور کترائے گا، قاعدے کی بات یہ ہے کہ آپ بچے کی تعریف کریں، اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس کو پیار سے اس طرح کے اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کریں، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بچہ کا ہدیہ قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے اس سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ اس موقع پر بڑوں کا ردعمل اس کو ہمیشہ یاد رہتا ہے، اس کو ہرگز یہ بات نہیں یاد رہے گی کہ آپ کے دوست نے ہدیہ قبول کیا لیکن ہمیشہ اس پر ان کی جانب سے ہونے والے ردعمل کا استحضار ضرور رہے گا۔

نوٹ: ''اس ماہ بعض اسباب کے سبب اس قسط کو مختصر کیا جارہا ہے آئندہ ماہ قسط کا بقیہ شائع کیا جائے گا''۔

☆☆☆

توجہ طلب

نئے اسلامی سال کا آغاز۔۔۔

نئی نسلوں کو واقف کرانے کی ضرورت

مفتی تنظیم عالم قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

اسلام آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے، قیامت تک ساری انسانیت کے لئے یہی مدار نجات ہے، رسول اکرم ﷺ نے جب اہل مکہ کو اس راہ نجات کی دعوت دی تو نہ صرف انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے سخت مخالف اور جانی دشمن بن گئے، جو لوگ اسلام قبول کرتے انہیں سخت سے سخت سزائیں دیتے مارتے اور حددرجہ تک پریشان کرتے تھے، اس سے تبلیغ اسلام کے لئے بڑی رکاوٹ کھڑی ہوگئی، بہت سے لوگ چاہتے ہوئے بھی ان خطرات اور اندیشوں کے سبب اسلام قبول نہ کرتے تھے اور جو لوگ اسلام میں داخل ہو گئے تھے ان کے لئے مکمل آزادی نہیں تھی، کفار مکہ کی اذیت رسانی کے خوف سے احکام الٰہی پر کھل کر عمل نہیں کر سکتے تھے، جب مکہ کی سرزمین ان کے لئے تنگ کردی گئی اور اللہ کا نام لینا وہاں دشوار ہوگیا تو اللہ تعالی نے سارے مسلمانوں کو مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا تاکہ وہاں اپنی عزت وآبرو کے ساتھ ساتھ اپنے ایمان کو باقی رکھ سکیں اور کھل کر احکام الٰہی پر عمل کر سکیں، حکم خداوندی پاکر رسول اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام مکہ چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے مدینہ آگئے، محض ایک اللہ کی رضا اور اپنے دین وایمان کے تحفظ کے لئے مسلمانوں نے اپنے اہل وعیال اعزاء واقارب، مال ودولت، گھربار اور ہر متاع عزیز کو قربان کردیا۔ زندگی بھر ایک ایک تنکا جمع کر کے آشیانے بنائے جاتے ہیں جب انہوں نے اپنی زندگی کی کمائی ہوئی دولت اور تیار کیا ہوا گھربار چھوڑا ہوگا تو انسانی فطرت کے لحاظ سے دل پر جس بارگراں کا احساس ہوگا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، مگر قربان جائیے ان کے مضبوط ومستحکم ایمان پر جس کے سبب یہ دشوار ترین مرحلہ بھی ان کے لئے آسان تھا، تاریخ انسانیت ان حضرات مہاجرین کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔

نبوت کا تیرھواں سال صفر کی ۲۷/ تاریخ اور جمعہ کی شب تھی جب آپ ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنی معیت

میں لئے ہوئے نہایت راز داری کے ساتھ مدینہ کی طرف چلے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے غلام عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن اریقط بھی خدمت ورہنمائی کے لئے ساتھ تھے، غار ثور اور مختلف جگہ قیام کرتا ہوا چار افراد کا یہ مختصر قافلہ ۱۲ ربیع الاول کو مدینہ کی مضافاتی بستی ''قبا،، پہنچا یہاں پہلے سے ہی ایمان کا نور پہنچ چکا تھا، رسول اکرم ﷺ نے یہاں مسجد قبا کی بنیاد ڈالی اور چند دنوں قیام کے بعد مدینہ منورہ داخل ہوئے، عظیم الشان استقبال کیا گیا، مدینے کا ذرہ ذرہ اس دن روشن تھا ہر طرف خوشیوں اور بے پناہ مسرتوں کا ماحول تھا۔ انصار صحابہ فرش راہ بنے ہوے تھے، ان لوگوں نے ہجرت سے قبل بیعت کے وقت جو وعدہ کیا تھا وہ سچا کر دکھایا، روز اول سے اخیر تک ان کے عشق ومحبت میں کوئی کمی نہیں آئی، مشکل ترین حالات میں بھی وہ سینہ سپر رہے اور مہاجرین کا ایسا بھرپور تعاون کیا کہ انہیں مدینہ میں کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا، اسلام کے لئے انصار صحابہ کی قربانی کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی، آپسی تعاون اور اجتماعیت سے اسلام کو قوت ملی اور ایک وقت آیا کہ فتح مکہ کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ ہر طرف اسلام کے جھنڈے بلند تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا جزیرۃ العرب اسلام کے آغوش میں آگیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں اسلام کی روشنی عرب کے علاوہ عجم پر پڑنی شروع ہوئی، اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے، مختلف ممالک پر اسلام کا قبضہ ہوا اور وسیع وعریض حصوں پر اسلام کی حکمرانی جاری ہوگئی، اس موقع پر لوگوں کو باضابطہ طور پر تاریخ کی ضرورت پیش آئی تاکہ کاروبار، لین دین اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اس کا حوالہ دیا جاسکے، خود حکومتی کام کے پھیل جانے کے سبب حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اس کی ضرورت کا احساس تھا، لوگوں کے مطالبہ اور حکومتی ضرورت کے تحت حضرت عمر فاروقؓ نے اہم صحابہ کرام کی ایک میٹنگ بلائی تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ اسلامی تاریخ کا آغاز کہاں سے کیا جائے، بعض نے مشورہ دیا کہ اس تاریخ کی ابتدا بعثت نبوی سے ہونی چاہئے، بعض نے کہا ہجرت سے اور بعض نے وفات نبویؐ سے آغاز کا مشورہ دیا، کافی غور وخوض اور بحث ومباحثہ کے بعد ہجرت کو اسلامی تاریخ کا معیار قرار دیا گیا، چوں کہ ہجرت ہی سے حق وباطل میں فرق قائم ہوا اور یہیں سے اسلام کے عزت وغلبہ کا آغاز ہوا، گویا عقیدہ وایمان، صبر وثبات اور شجاعت وحوصلہ مندی کا قیمتی راز ہجرت میں پوشیدہ تھا اور یہ اسلام کے عروج کے لئے اہم موڑ تھا، اس لئے حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر صحابۂ کرام نے اسلامی تاریخ کے آغاز کے لئے ہجرت کے سفر کو پسند کیا مگر اسلامی تاریخ کے سنہ کا پہلا مہینہ محرم متعین کیا گیا حالانکہ ہجرت کا آغاز ۲۷ رصفر کو ہوا تھا، اس کی دو وجہیں لوگوں نے بیان کی ہیں،

پہلی وجہ یہ ہے کہ انصار صحابہ نے حج کے موقع پر آپ ﷺ سے بیعت کی اور مدینہ آنے کی دعوت دی ، اخیر ذی الحجہ میں جب یہ انصار واپس ہوئے تو اسی وقت آپ ﷺ نے ہجرت کا ارادہ فرما لیا اور صحابہ کرام کو بھی ہجرت کی اجازت دے دی' یہ محرم الحرام کا مہینہ تھا، گویا ارادۂ ہجرت کا اعتبار کرتے ہوئے اسلامی تاریخ کا پہلا مہینہ محرم الحرام کو قرار دیا گیا ہے، بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اہل عرب حج کے ایام گذرنے کے بعد اپنی تجارت کا دوبارہ اسی مہینے سے آغاز کرتے تھے اور یہ مہینہ محترم بھی ہے، اس لئے سنہ ہجری کا آغاز اس مہینے سے کیا گیا، بہر حال سنہ ہجری کی تعیین کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس تاریخ کے استعمال کا اہتمام کیا اور ان کے بعد تابعین، تبع تابعین' فقہاء' محدثین اور علماء کرام و بزرگوں نے اس کا اہتمام کیا کیوں کہ اسلامی تقویم اور سنہ ہجری شعائر اسلام میں سے ہے، اسلام کے بہت سے احکام قمری تاریخوں سے وابستہ ہیں نماز روزہ ، حج' زکوۃ قربانی' عیدین' شب براءت' شب قدر، عدت طلاق یا عدت وفات وغیرہ جتنے امور ہیں ان کا تعلق اسی قمری مہینوں اور سنہ ہجری سے رکھا گیا ہے' قرآن کریم نے اس کی افادیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: يَسْـــأَلُــونَکَ عَــنِ الأَهِـلَّةِ قُـلْ هِـيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَج (البقرۃ'۱۸۹)

''اے نبی !لوگ آپ سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورت کے بارے میں سوال کرتے ہیں' آپ فرما دیجئے کہ یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کی تعیین کی اور حج کی علامتیں ہیں''

یعنی چاند کے ذریعے تمہیں تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہوتا ہے جس پر تمہارے معاملات' عبادات' حج ، روزہ ، زکوۃ ، عید' بقر عید وغیرہ کی بنیاد ہے، اس لئے قمری مہینوں اور تاریخوں کا حساب وکتاب یاد رکھنا اور اس کو اپنے معاملات میں استعمال کرنا تمہارے ایمان کا حصہ ہے، ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے کہ قمری اور سنہ ہجری کی تاریخوں کو استعمال کرے اور کم از کم اپنے نجی معاملات اور روزمرہ کی ضروریات میں اس کو رواج دے، اس سے قمری اور ہجری تاریخ محفوظ رہے گی، لوگوں کو اس کے ذریعے ایک مہتم بالشان واقعۂ ہجرت کا علم ہوگا اور رسول اکرم ﷺ سے محبت کا اظہار بھی ہوگا۔

محرم، صفر، ربیع الاول اور دیگر تمام اسلامی مہینے اور دنوں کے نام آپ ﷺ کی زبان نبوت سے ادا ہوئے ہیں، جب ایک شخص ان دنوں اور مہینوں کو لکھے اور پڑھے گا تو اس وقت فوراً یہ خیال آئے گا کہ آج اپنی زبان سے جن مہینوں کا ہم نام لے رہے ہیں یہ وہ مہینے ہیں جو زبان نبوت سے ادا ہوئے ہیں، اگر نیت صالح اور جذبہ صادق ہو تو رسول اکرم ﷺ سے محبت میں اضافہ ہوگا ان کی قربت نصیب ہوگی اور اجر وثواب کا بھی وہ مستحق ہوگا،

اس لئے حضرات فقہاء اور اہل نظر علماء دین نے اگر چہ شمسی اور انگریزی تاریخوں کے استعمال سے منع نہیں کیا لیکن ہجری اور اسلامی تاریخوں کے استعمال کو فرض کفایہ قرار دیتے ہوئے اس کے استعمال کی ترغیب دی ہے اور آفسوں اور دفتروں میں نہ سہی مگر کم ازکم اپنی نجی ضروریات میں اس کے استعمال کی تاکید فرمائی ہے تاکہ مسلمانوں کا قومی شعار اور اس کی شناخت محفوظ رہے اور اپنے نبی ﷺ سے محبت کا اظہار ہو سکے، لیکن یہ افسوسناک ہے کہ آج کل قمری تاریخوں سے اس قدر بے اعتنائی برتی جارہی ہے کہ اچھے اچھے لوگوں کو بھی یہ تاریخیں یاد نہیں رہتیں اور نہ وہ ان کا استعمال کرتے ہیں' شادی کارڈ، نجی ڈائری یا اپنے ضروری کاغذات میں بعض لوگ لکھتے بھی ہیں تو قمری تاریخوں کو ثانوی درجے میں رکھتے ہیں اور نئی نسلوں کو دیکھا جائے تو ان کو جنوری، فروری کے علاوہ کچھ بھی معلوم نہیں۔ ہجرت کیا چیز ہے، ہجری اور اسلامی تاریخوں کی کیا اہمیت ومعنویت ہے 'اسلام سے اس کا کیا تعلق ہے اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ان چیزوں کا نئی نسلوں اور آج کے نوجوانوں کو کچھ علم نہیں بلکہ نئے سال کا آغاز کب ہوا اور کب ختم ہوا کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ اسلامی سال کے آغاز واختتام پر کسی خوشی کا اہتمام نہیں کیا جاتا، جب کہ انگریزی سال کے آغاز و اختتام پر پٹاخے پھوڑے جاتے ہیں، ایک دوسرے کو مبارکباد دی جاتی ہے، مختلف تقاریب کا انعقاد عمل میں آتا ہے، یہ طرز عمل اگر چہ درست نہیں لیکن یہ کتنی بے حسی کی بات ہے کہ محرم الحرام کا مہینہ شروع ہورہا ہو ہجری کیلنڈر کے پہلے مہینے کا آغاز ہو اور مسلم نوجوانوں کو اس کا علم بھی نہ ہو' اسلامی شعار سے اس غفلت پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے، بلاشبہ سال کا آغاز واختتام خوشی و مسرت کا موقع نہیں بلکہ یہ احتساب اور منصوبہ بندی کا وقت ہوتا ہے' وقت عظیم سرمایہ ہے اور سرمایہ کے گھٹنے پر افسوس اور مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کی جاتی ہے نہ کہ اس پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، انگریزی تہذیب وتمدن کی یلغار نے جس طرح اسلامی تہذیب کو آج مٹا دیا ہے اسی طرح انگریزی تاریخوں کی کثرت استعمال اور اس کے رواج نے قمری مہینوں اور تاریخوں کو بہت پیچھے کر دیا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ قمری مہینوں اور تاریخوں کو کم ازکم اپنے نجی معاملات میں استعمال کرنے کا اہتمام کیا جائے' نئی نسلوں اور نوجوانوں کو ان کی تاریخی اور شرعی حیثیت سے واقف کرایا جائے ان کے استعمال پر انہیں ابھارا جائے اور اسلامی تقویم کا اتنا چرچہ کیا جائے کہ کوئی بھی مسلمان اس سے غافل نہ رہ سکے۔

☆☆☆

زبان و ادب

اقبال کی نظم
طلباء علی گڑھ کالج کے نام

ڈاکٹر محمد علی جوہر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سرسید نے اپنی ادبی تحریک کے دوران مثالی شاعر یا مثالی شاعری کا جو تصور پیش کیا تھا، چند ہی دہائیوں بعد اقبال اس کی عملی تصویر کے طور پر سامنے آئے، بالفاظِ دیگر اقبال سرسید کے خوابوں کی سچی تعبیر تھے۔ اقبال پیامی شاعر تھے۔ ان کی نظموں میں ملت اسلامیہ کے نوجوان فرزندوں کے لیے کوئی نہ کوئی پیام ضرور ہوتا ہے۔ دوران تعلیم فلسفہ ان کا پسندیدہ مضمون رہا تھا۔ انہوں نے قرآن کریم اور اسلامی لٹریچر کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور ایک اسلامی فلسفے کی بنیاد ڈالی تھی۔ اپنی شاعری سے متعلق اقبال کا یہ دعویٰ کہ ان کی شاعری قرآن و حدیث کی منظوم تفسیریں ہیں، حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔ اقبال خود کو شاعر سے زیادہ فلسفی اور فنکار سے زیادہ مصلح ومبلغ سمجھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں شاعری اور فلسفہ کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ گرچہ انہوں نے بار بار اپنی شاعرانہ حیثیت کی تردید کی ہے اور خود کو محض ایک مفکر ومبلغ بتایا ہے۔ مثلاً:

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

یا، انتقال سے کچھ ہی دن قبل لاہور ریڈیو کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ان کا کہنا کہ ''میرا مقصد شعر و شاعری نہیں میں تو فکر و نظر میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہوں'' ان دونوں بیانات سے اقبال کے یہاں اپنی شاعرانہ حیثیت سے انکار سے کہیں زیادہ شاعری میں مقصدیت پر ان کا اصرار ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے شاعری کو ایک وسیلۂ اظہار کے طور پر اختیار کیا تھا۔ لیکن غیر شعوری طور پر ہی سہی انہیں استحکام و اعتبار فلسفے سے زیادہ شاعری میں حاصل ہوا۔ بقول میر ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

علامہ نے غزلیں بھی کہیں ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے مصلحانہ افکار و خیالات کو بڑی کامیابی اور ہنرمندی کے ساتھ نظم کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ان کی بیش تر نظمیں 'ارتباط حرف و معنی اختلاط جان و تن' کے پیمانے پر پوری اترتی ہیں۔ ان کی نظموں میں موضوع کا انتخاب، مضامین کی پیش کش، شعری وسائل کا خوبصورت استعمال بکثرت موجود ہے۔ علامہ مروجہ ہیئت کو من و عن قبول کرنے کے بجائے اس میں حسبِ ضرورت تبدیلی کر لیتے ہیں۔ اپنی بات کو موثر انداز میں پیش کرنے کے لیے نئے نئے طریقۂ

کار کی جستجو ان کی عادت ہے۔ انہی طریقۂ کار میں ایک خوبصورت طریقہ یہ ہے کہ اپنی بات کو اپنی طرف سے پیش کرنے کے بجائے کسی اہم شخصیت یا مشہور و معروف کردار کی زبانی پیش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنی نظموں میں ڈرامائی عناصر سے بھی خوب کام لیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں مختلف کار آمد صنعتوں مثلا تشبیہ، تلمیح، استعارہ اور کنایہ کا خوبصورت استعمال پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پیکر تراشی بھی ان کی نظموں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

زیر بحث نظم غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ بحر رواں اور مترنم ہے۔ اخیر کے دو مصرعے الگ ردیف و قافیہ میں ہونے سے ترجیع بند کا التباس پیدا ہوتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غزل کی ہیئت جو مسلسل اظہار خیال کے لیے ناموزوں سمجھی جاتی تھی، علامہ نے کس خوبصورتی اور خلاقیت کے ساتھ اس ہیئت کا استعمال کیا ہے۔ شاید اس اقدام کے پیچھے یہ مقصد ہو کہ نظم نگاری کے لیے غزل کی ہیئت میں پوشیدہ امکانات کو ظاہر کر کے ہم عصر شعراء کو دعوت سخن دی جائے۔ نظم کی ہیئت کے ساتھ ردیف اور قافیہ بھی ہماری توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

سات اشعار پر مشتمل نظم اول تا آخر رمز و ایما کے پردے میں لکھی گئی ہے اور اس میں صنف غزل کی کئی اہم خصوصیات مثلاً رمزیت و ایمائیت اور سوز و گداز اور ایجاز و اختصار کی خوبیاں بھی واضح طور پر موجود ہیں۔ پوری نظم میں ایک بھی لفظ یا حرف ایسا نہیں ہے جسے ہم غیر ضروری یا قابل حذف کہہ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی استعاروں اور کنایوں کا ایک مکمل نظام بھی نظر آتا ہے جو دانشورانہ سطح پر ترسیل و ابلاغ کے فرائض بخوبی انجام دیتے ہیں۔

زیر بحث نظم کی تفہیم و تشریح کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظم کے متن کو سامنے رکھ ان تمام الفاظ و تراکیب کے معنی متعین کئے جائیں جن کا اس نظم میں تخلیقی طور پر استعمال ہوا ہے۔

نظم کا متن:

طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمندوں کا طرز کلام اور ہے
طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائر بام اور ہے
آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکون
کہتا تھا مورِ ناتواں لطف خرام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے
شمعِ سحر یہ کہہ گئی، سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے
بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پر تم خشتِ کلیسیا ابھی

علامہ اقبال نے یہ نظم غزل کی ہیئت میں لکھ کر ایک کامیاب فنی تجربہ کیا ہے۔ بظاہر یہ نظم غزل مسلسل معلوم ہوتی ہے، لیکن اپنے فکری نظام کی بنا پر یہ انوکھی تخلیق نظم جدید کے بنیادی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس نظم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اقبال نے غزل کی ہیئت میں نظم جدید کے پوشیدہ امکان کو برائے کار لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

تشریح متن:

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمندوں کا طرز کلام اور ہے

نظم کے پہلے شعر کی ابتدا لفظ ''اوروں'' سے ہوتی ہے جو لفظ ''میرا'' کی ضد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یہاں اوروں سے مراد تعقل پسند لوگ ہیں جو دردمندانِ عشق کے برعکس شناخت رکھتے ہیں۔ ''دردمند عشق'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اعلیٰ اور متعینہ مقاصد کے لیے کسی بھی ممکنہ کوشش سے گریز نہیں کرتے۔

پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ آج وہ طلباء علی گڑھ سے ایک سچے عاشقِ رسول کی حیثیت سے مخاطب ہیں اور جو پیغام وہ دے رہے ہیں، دنیاداروں اور زمانہ سازوں کے پیغام سے ذرا مختلف ہے۔

بالفاظ دیگر

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

یعنی اس دنیا میں مردمومن کیے لیے عشق رسول سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ اس کے بغیر جو کچھ ہاتھ آئے گا وہ بولہبی یعنی گمراہی وضلالت سے تعبیر کیا جائے گا۔

طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائر بام اور ہے

''طائر زیر دام'' کنایہ ہے۔ غلامی کی زندگی بسر کرنے والے لوگوں سے۔ اس زمرے میں ان لوگوں کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جو عقل پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ ''طائر بام''، ''طائر زیر دام'' کی ضد کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس سے اہل ایمان مراد ہیں۔

دوسرے شعر میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک مردمومن کا مشورہ یا تعلیم ایک محکوم وغلام شخص کے مشورے یا تعلیم سے یقیناً بہتر اور کارآمد ہے۔

آتی ہے کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکون
کہتا تھا مورِ ناتواں، لطف خرام اور ہے

''رازِ حیات'' سے ایک کامیاب اور مثالی زندگی مراد ہے۔ ''سکوں'' سے مراد وہ دھیان ہے جو نروان کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ ''مورِ ناتواں'' کا ذکر کوہ کی ضد کے طور پر کیا گیا ہے۔ ''لطف خرام'' سے مراد ایک متحرک زندگی ہے جو خودی کی تکمیل کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

تیسرے شعر میں بحیثیت مردمومن وہ طلباء علی گڑھ کو رہبانیت اور اسلامیت (مومنیت) کا فرق سمجھاتے ہوئے اپنی خودی بیدار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

جذبِ حرم سے ہے فروغ، انجمن حجاز کا
اس کا مقام وار ہے اس کا نظام اور ہے

''جذب حرم'' بمعنی عشق رسول یا عشق اسلام استعمال ہوا ہے۔ ''انجمن حجاز'' سے اسلامک ممالک مراد لیے جا سکتے ہیں۔ لفظ ''فروغ'' بمعنی آب وتاب یا ترقی وعروج استعمال ہوا ہے۔ ''مقام'' بمعنی مرتبہ یا حیثیت استعمال ہوا ہے۔ نظام سے شریعت اسلامی یا شرعی زندگی مراد ہے۔

چوتھے شعر میں علامہ ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے لیے ''حرم'' کو مرکز اسلام کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہوئے عالمی برادری (Pan Islamism) کا تصور پیش کرتے ہیں اور اسلامی اصول پر قائم کردہ نظام کو درست اور دوسرے نظام کے مقابلے پائیدار بتاتے ہیں۔

موت ہے عیشِ جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

''ذوق طلب'' سے عشق رسول کا مفہوم نکلتا ہے۔ ''گردشِ آدمی'' سے حالت عشق ومستی مراد ہے اور گردشِ جام سے عیش و

عشرت سے معمور مادی زندگی ہے۔

پانچویں شعر میں علامہ نے ذوق طلب یعنی عشق رسول سے عاری افراد یا جماعت کی عیش وعشرت سے معمور زندگی کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ بقول علامہ ایسے لوگ جن کے جہد وعمل کا مقصد مالی منفعت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دنیاوی اعتبار سے کتنے ہی کامیاب، خوش اور مطمئن کیوں نہ ہوں، اہلِ ایمان کی نگاہ میں یکسر خسارے میں مبتلا ہیں اور ان کی زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔

شمعِ سحر یہ کہہ گئی، سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

شمع سحر سے مراد وہ شمع ہے جو یا تو بجھ چکی ہے یا بجھا چاہتی ہے۔ یہاں لفظ شمع کسی تہذیب یا سلطنت کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ''شمع سحر'' زوال یافتہ مغلیہ سلطنت سے کنایہ ہے۔ ''سوز'' سے عشق الٰہی مراد ہے اور 'ساز'' سے مراد ایک کامیاب دنیاوی زندگی۔ دنیا کو غمکدۂ نمود اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ عارضی اور ناپائیدار ہونے کے علاوہ غم سے بھری ہوئی بھی ہے۔ ''شرط دوام'' سے مراد وہ ابدیت ہے جو زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے۔

چھٹے شعر میں اقبال بجھتی ہوئی شمع کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ سوز کے بغیر زندگی کا ساز ادھورا اور بے فائدہ ہے۔ یعنی عشق رسول اگر انسان کو میسر ہو تو غم سے بھری ہوئی یہ فانی دنیا بھی انسان کے لیے حیات ابدی اور دائمی مسرت کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ شمع سحر یعنی بجھتی ہوئی شمع سے ہمارا ذہن مغلیہ اقتدار کے خاتمہ کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے۔

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پر خشتِ کلیسیا ابھی

''بادہ'' سے مراد ایک اسلامی درس گاہ میں دی جانے والی تعلیم وتربیت ہے۔ ''بادہ نیم رس'' سے شراب عشق رسول کی پختگی مراد ہے یا اسلامی قومیت کی تحریک کا ابتدائی مرحلے میں ہونا مراد ہے۔ ''شوق نارسا'' سے عشقِ رسول یا اسلامی انقلاب سے متعلق ذوق وشوق کی ناپختگی مراد ہے۔ ''خم'' سے مراد وہ تعلیمی ادارہ (مدرسۃ العلوم علی گڑھ) ہے۔ جسے سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قائم کیا تھا، ''خشت کلیسا'' سے مراد انگریز پرنسپل یا انگریز اساتذہ ہیں جو ان دنوں ہندوستانی مسلمانوں کی بہی خواہی کا اعلانیہ اظہار کر رہے تھے اور مسلمانوں کی بہی خواہی کا یہ جذبہ انڈین نیشنل کانگریس (Indain National Congress) کی سرگرمیوں کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوا تھا۔

آخری شعر میں علامہ نے مدرسۃ العلوم کے طلباء کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ انگریز مخالف تحریکات سے متاثر ہو کر خود کو انگریز پرنسپل اور انگریز اساتذہ کی سرپرستی سے محروم نہ کریں۔ مسلمانوں کو جدید علوم وفنون کی بے حد ضرورت ہے اور ان کا حصول انگریز اساتذہ کی سرپرستی ہی میں بہتر طور پر ممکن ہے۔

اس نظم میں عشق کے تصور کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ علامہ نے اس نظم میں فلسفۂ خودی کے تقریباً تمام ترکیبی عناصر کو مختلف استعاروں میں پیش کر دیا ہے۔ یہاں یہ بیان کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ علامہ نے جو عشق کا تصور پیش کیا ہے وہ عشق کا ایک تخلیقی یا شاعرانہ تصور ہے، اسلامی نہیں، بہر حال یہ طلباء علی گڑھ کے نام ایک خوبصورت نظم ہے جو فکر وفن کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

☆☆☆

آخری صفحہ

پھر تو تمہارے لئے یہی کافی ہے

حضرت صعصہ بن معاویہؓ نورِ محمدی کی کرنوں سے فیضیاب اور فیضانِ نبوت سے مستفیض ہو چکے ہیں۔ مشہور شاعر فرزدق کے آپ چچا ہیں۔ ایک موقع پر وہ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو سورۂ زلزال سنائی یہاں تک کہ آپؐ اس آیت تک پہنچے ''فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ'' (سو جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو وہاں دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اس کو وہاں دیکھ لے گا) انہوں نے کہا اس کے بعد میں کچھ اور نہ سنوں تب بھی میرے لئے یہ کافی ہے۔ (رواہ احمد)

آپ ﷺ نے حضرت صعصہؓ کو تعلیم و تربیت کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا وہ چند دن آئے اور اس کے بعد غائب ہو گئے، رسول اکرم ﷺ نے مجلس میں جب کئی دن تک ان کو نہیں دیکھا تو حضرت علیؓ سے اس بابت دریافت کیا، حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ وہ کچھ دن تو میرے پاس آئے اور پھر اچانک غائب ہو گئے آپ لوگوں سے ان کے بارے میں دریافت کریں۔ آخر ایک صحابی کی ان سے ملاقات ہو گئی، وہ لکڑی کا گٹھا سر پر لئے بیچنے جا رہے تھے، انہوں نے کہا ''رسول اللہ ﷺ آپ کے بارے میں دریافت فرما رہے تھے چل کر ملاقات کر لو'' لکڑی فروخت کر کے جلدی جلدی حضورؐ کی خدمت میں پہنچے، آپؐ نے کئی روز تک نہ آنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا ''میں اس لئے نہیں آیا کہ میری تعلیم پوری ہو گئی آپؐ نے فرمایا مختصر عرصے میں تمہاری تعلیم کیسے پوری ہو گئی، انہوں نے کہا میرے سامنے قرآنِ مجید کی یہ آیت ''فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ'' ہے۔

اس آیت کے بعد میری کیفیت اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ جب بھی کوئی کام کرتا ہوں تو یہ خیال آجاتا ہے کہ قیامت میں اس کا انجام کس صورت میں سامنے آئے گا، اگر اچھا ہوتا ہے تو اس کو کرتا ہوں اور اگر اس اعتبار سے کھٹک پیدا ہوتی ہے تو رک جاتا ہوں پھر وہ کام مجھ سے نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تو تمہارے لئے یہی کافی ہے''۔

انسان کو ''رب زدنی علماً'' کے تحت مزید علم کی تلاش جاری رکھنی چاہئے مگر علم سے مقصود محض معلومات کا ذخیرہ جمع کرنا نہ ہو بلکہ حضرت صعصہؓ کا سا جذبۂ عمل ہو کہ علم کا حصول عمل کی نیت سے ہو، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ جذبہ ہو تو بسا اوقات ایک بات ہی انسان کی زندگی میں صالح انقلاب لانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

لیکن افسوس کہ آج ہم میں سے اکثر کی حالت یہ ہے کہ ہمارے قول و عمل میں تضاد ہے، ہم کردار سے زیادہ گفتار کے غازی ہیں، اور شاعر مشرق علامہ اقبال کے ان اشعار کے مصداق ہیں۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح کے لئے اپنے سے کسی بڑے مربی و مصلح کے سامنے جانے سے عار محسوس کرتے ہیں، استکبارِ علمی کی وجہ سے عمل سے دور ہیں۔

اور ظاہری علوم کی وجہ سے خوش ہیں، ہم کو اپنے علم پر ناز ہے اور شاید ہمیں جیسے لوگوں کے لئے قرآن مجید نے کہا ہے فرحوا بما عندھم من العلم (وہ لوگ اس علم ہی کی وجہ سے خوش ہیں جو ان کے پاس ہیں۔)

لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنے اندر حضرت صعصہؓ جیسا جذبۂ عمل پیدا کریں کیوں کہ عمل ہی سے زندگی بنتی ہے بقول اقبال ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ایک دوسرے شاعر کے الفاظ میں

تاخیر کا موقع نہ تذبذب کا عمل ہے
یہ وقتِ عمل، وقتِ عمل، وقتِ عمل ہے

☆☆☆ (ق۔م۔ن)

R.N.I. No. UPURD / 2009 / 32310
Postal Regd. No. G104/2010/2012

(Vol.VI -Issue-VI)
(December- 14)

NIDA-E-AETIDAL MONTHLY

Madrasatul Uloom-al-Islamia, Jamalpur, Aligarh (U.P.)

Under the management of :

Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation, Aligarh

اپیل

قارئین کرام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ حضرات مختلف طریقوں سے "علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کی کارکردگی سے واقف ہوتے رہتے ہیں، فاؤنڈیشن مدارس ومکاتب کے علاوہ دیگر تعلیمی ودعوتی کام انجام دے رہا ہے لیکن اس کے پاس کوئی مستحکم ذریعہ آمدنی نہیں ہے، کیا ہی خوب ہو کہ آپ حضرات خود بھی اس کی معاونت کے لئے فکر کریں اور اپنے احباب کو بھی متوجہ کریں، ضروری نہیں کہ بڑی رقم کے ذریعہ تعاون کیا جائے،

تعاون کو آسان بنانے کے لئے چند تجاویز پیش خدمت ہیں:

۱۔ الحمدللہ آپ حضرات صاحب نصاب ہیں، کیا ہی بہتر ہو کہ آپ اپنی زکوۃ کا 70% اپنی مرضی کے مطابق جن حضرات کو چاہیں دیں لیکن اپنی زکوۃ کا 30% فاؤنڈیشن کے لیے خاص کردیں تو طلبہ کی ضروریات و اخراجات کو پورا کرنا آسان ہوجائے۔

۲۔ آپ سال کے آخری ایک مہینہ کی اپنی آمدنی میں سے 2% فاؤنڈیشن کو بطور عطیہ دیں تا کہ کارکنان کی تنخواہ وغیرہ کا صاف رقم سے انتظام کیا جاسکے، جو مستقل ایک اہم چیلنج ہے۔

۳۔ آپ خود بھی ماہانہ ممبر بن سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی صدقۂ جاریہ میں حصہ لینے کی ترغیب دے سکتے ہیں، ماہانہ ممبر شپ سے ماہانہ اخراجات کا بوجھ کم ہوسکتا ہے اس کے لیے آپ صرف نیت کریں کہ اپنی آمدنی کا 0.03% فاؤنڈیشن کو دینا ہے، اس سے بہت سے انتظامات آسان ہوسکتے ہیں۔

۴۔ فاؤنڈیشن کے تعمیری کاموں میں حصہ لے کر بھی آخرت سنواری جاسکتی ہے، ضروری نہیں کہ پوری عمارت تعمیر کرائی جائے، اگر ۲۰-۲۵ مختلف حضرات ایک ایک کمرہ کی ذمہ داری لے لیں تو ایک عمارت تعمیر ہوجائے، خود نیت کریں اور دوسروں کو متوجہ کریں، کیوں کہ خیر کی طرف دلالت کرنا گویا خیر کو انجام دینا ہے، اس لیے کہ کرنے والے اور دعوت دینے والے کو یکساں ثواب ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ان تجاویز پر غور کرنا اور عمل درآمد کرنا آسان فرمائے اور فاؤنڈیشن کے ملی وتعلیمی کاموں میں ہماری مدد فرمائے۔

پروفیسر محمد مسعود خالد	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی
معتمد مالیات فاؤنڈیشن	پرنسپل مدرسۃ العلوم الاسلامیہ	جنرل سکریٹری فاؤنڈیشن
09412272796	09897776652	09837989431

بیرونی ممالک کے لئے **A/c (1)** Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation
Union Bank of India Dodhpur, Aligarh A/c No. 452202010077737 (only for NRE) FCR No. 136220046

اندرون ملک کے لئے **A/c (2)** Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation
Allahabad Bank (AMU Branch) A/c No. 50157077631

Indian # 9219298046

Visit us : www.nadwifoundation.org

Printed & Published by: Printer & Publisher Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadvi Educational & Welfare Foundation
Hamdard Nagar 'D', Jamalpur, Aligarh at Indian Printing Work, Jamalpur, Aligarh

Editor : Dr. Mohd. Tariq Ayubi Nadwi